

فہرست

فہرست

نگار

۱۹۲۲

دسمبر

رجسٹر نمبر ۱۱۰۴

مجلد
شمار

۱
۳

شعبان ۱۳۴۰ھ اپریل ۱۹۲۲ء قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

فہرست

۵۸	نیاز	۲	مسئلہ نور	۲	نیاز	ملاحظات
۶۲	نیاز	۳	محبت کی دیوی	۳	نیاز	فرانس کی اعظم پستی
۷۰	لطیف الدین احمد	۹	دو صنائع	۹	محمد صادق علیخان نظر	غزل
۷۰	حضرت فانی بی۔ اے (علیگ)	۱۰	غزل	۱۰	قمر	عجم کے کارنامے
۷۱	نیاز	۲۱	حکومت اسلام اور سنسکرت	۲۱	نیاز	ڈراما اور رومان
۷۳	نیاز	۲۹	غزل	۲۹	نیاز	غزل فارسی
۷۴	نیاز	۳۰	معلومات	۳۰	لطیف الدین احمد	لالہ رخ
۸۰	نیاز	۵۶	یاران نجد	۵۶	حضرت مسما (علیگ)	غزل
		۵۷		۵۷	حضرت ناصر	مزار (نظم)

عبدال

ملاحظات

۱۔ ملک میں جس شوق کے ساتھ نگار کی پذیرائی کی گئی وہ بہت امید افزا ہے اور باب ذوق نے جس لطف سے کام لیا اپنی قیمتی رائیں ظاہر کیں وہ ہمارے لیے مسرت ہے۔
۲۔ بہت تک جتنے مضامین موصول ہوئے اور ستر دہائی گئے انہیں اکثر حصہ ادبی مضامین کا تھا اور وہ بھی نگار کے رنگ کا اسلئے میں ہمیشہ کیلئے یہ تیار رہا جاتا ہوں کہ اس رنگ کا کوئی ادبی مضمون شائع نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کوئی خاص ندرت نہ پیدا کی جائے مختصر افسانے نہایت شکر یہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے اگر اس موضوع کے تمام خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے۔

۳۔ دوسری اشاعت میں ایک مضمون آرزو کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ مسودات میں مخلوط ہو جانے کی وجہ سے وہ مضمون لکھ گیا اور رسالہ طبع ہو جانے کے بعد اسکا پتہ چلا۔ پہلی اشاعت میں نظم اندر پرستش "مستر براؤن کی کتاب سے لی گئی تھی۔

۴۔ نگار میں باوجود اعلان اسوقت تک کوئی تصویر شائع نہیں ہوئی جسکا سبب صرف یہ ہے کہ پہلی تصویر کا بلاک ناقص بنا تھا اور بعد کو جو تصاویر فراہم کی گئیں ان کے بلاک ہنوز تیار ہو کر نہیں آئے۔ چوتھی اشاعت سے اک نہایت دلچسپ سلسلہ مضامین علم ہدایت کے متعلق شروع کیا جائیگا اور پانچویں نمبر میں تین تصاویر اس مخصوص فن کے متعلق شائع کی جائیں گی، جو گذشتہ فرد گزشتہ کی تلافی کر سکیں گی۔

۵۔ روزنامہ سیاست نے حال ہی میں نگار کا ایک مضمون "مغرب میں اخبار کی نوکمرتب ہوتا ہے" نقل کیا ہے لیکن نگار کا حوالہ نہیں دیا۔ اور

حریم

نسوانی ذوق کو پورا کرنے والا واحد علمی و ادبی رسالہ

نظام تمدن کا وہ اہم ترین پہلو، جو سب سے پہلے عالم انسانی میں توجہ اپنی طرف جذب کر سکتا ہے، اس جنس سے متعلق ہے جسے ہم لطیف، نازک اور سریع التاثر کہتے ہیں، لیکن اسکا کیا علاج کہ ضرورت کی شدت کے ساتھ ہمارے احساس میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا، دراصل ایک جو چیز سب سے زیادہ نازک ہو اسی کی حفاظت زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ اسوقت کوئی ایسا رسالہ اردو میں موجود نہیں ہے جو صنف نازک کی ضرورت و جذبہ کا خط سے انکا بہترین شریک ثابت ہو اور انکے لیے بہترین علمی ادبی سرمایہ سازدہ والا اشاعت نگار نے اس فقدان کو محسوس کر کے آخر کار فیصلہ کر دیا ہے کہ آئندہ جولائی سے ایک نسوانی رسالہ بھی حریم کے نام سے شائع کیا جائے جو اپنی طباعت کتابت، مضامین و مطالب حسن صوری و معنوی کے لحاظ سے خواتین کا بہترین رفیق ثابت ہو۔

کوشش کی جائیگی کہ اس نسوانی زندگی کے تمام سنجیدہ و اہم ضروریات پر بہترین معقولہ و مضامین شائع کی جائیں جنہیں دیکھ کر مرد جان سکیں کہ عورتیں کس تربیت کی مستحق ہیں اور عورتیں یہ سمجھ سکیں کہ فطرت نے انہیں کس مقصد کیلئے پیدا کیا ہے اور ملک و قوم کا مستقبل انہیں کس چیز کا طلبگار ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس تحریک کا خیر مقدم نہایت امید افزا طریق پر کیا جائیگا اور اس سے ہمیں بخیر نہ رکھا جائیگا۔

مینجر نگار

فرانس کی عاظم پرستی

ملی حمیت و خودداری کا اک عجیب و غریب گارنامہ

نیولین کی حیات بعد المات

(۱)

نیولین اعظم کے آخری ایام حیات جس عالم بیکسی میں بسر ہوئے، وہ تاریخ فرانس کا نہایت دروند واقعہ ہے، لیکن جبوقت اس حقیقت پر غور کیا جاتا ہے کہ اس واقعہ سے قبل، سہزرین فرانس کیلئے نیولین نے کیا کیا قربانیاں کیں، کن کن اداؤں سے اس نے اپنے وطن پرستی کا ثبوت دیا اور ملک قوم کی محبت میں اس نے کس طرح اپنے آپ کو فنا کر دیا، تو اس واقعہ کی دردمندی اک نشان ہدایت ہو کر رہ جاتی ہے، جس کے عوض میں ایک شخص کیلئے جان دیدینا بھی حد درجہ آسان ہو جاتا ہے اور اس تکلیف کے تبادلہ میں ایک قوم کے لئے، اپنی بہترین راحتوں سے دست بردار ہو جانا بھی نہایت ازاں سودا قرار پاتا ہے۔

نیولین نے فرانس کیلئے کیا کیا، فرانس کی ترقیاں کس حد تک اس کی ممنون ہیں۔ یہ تاریخ عالم کے وہ غیر فانی نقوش ہیں، جنہیں زمانہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا، اور جو ہمیشہ مجالس رزم و بزم میں دہرائے جائیں گے، لیکن وہ لوگ جنہوں نے نیولین کو صرف ایک فاتح قاید اعظم کی حیثیت سے دیکھا ہے، انھیں یہ صداقت بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ نیولین کو جو تعلق فرانس سے تھا، اسکی بنیاد ملوکانہ عزائم پر قائم نہ ہوئی تھی، بلکہ اس شدید جذبہ محبت پر استوار ہوئی تھی، جسے اب فدویت و فداکاری سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر جس طرح پولین کو اپنے ملک کے ساتھ عشق تھا، اسی طرح اہل فرانس میں بھی اسکے لئے حد درجہ عقیدہ مند شنف پایا جاتا تھا، اور یہی وہ رابطہ باہمی ہے جس سے ایک قوم کا مستقبل رونما ہوتا ہے اور یہی وہ اعظم پرستی ہے جس سے ایک ملک کی زندگی وابستہ ہے۔

جب ۱۸۲۱ء میں پولین ایک دور افتادہ جزیرہ ہیلینا کے اندر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، تو صرف یہ خیال اسکے لئے تکلیف دہ تھا کہ وہ فرانس سے باہر دم توڑ رہا ہے اور اسکی نگاہیں اس فضا میں تحلیل ہو رہی ہے، جو اسکے وطن و ارباب وطن سے بہت دور ہے۔ لوگوں کو خیال تھا کہ جب وقت پولین کا وصیت نامہ پڑ جائیگا تو اس میں خدا جانے کیا کیا خوشیاں گھسی گئی ہوں گی، لیکن وہ بھی کیسا دلگداز منظر تھا جب اسکی آخری تمنا کے بابت سوال کیا گیا اور اسنے سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہا کہ :-

”میری ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے منتقل کر کے دریائے سین کے ساحل پر دفن کی جائیں تاکہ میں اپنی قوم والوں کے ساتھ پرسکون گہری نیند سوتا رہوں۔“

افسوس ہے کہ اس عہد کے مسائل سیاسیہ نے اس وصیت کی تکمیل کو تعویق میں ڈال دیا اور کال انیس سال تک پولین کی لاش اسی غیر آباد جزیرہ میں مدفون رہی۔ ہر چند وفات پولین کے تین ماہ بعد ہی حکومت فرانس سے درخواست کی گئی کہ اس وصیت کو پورا کیا جائے اور اسکے بعد ہی ۱۸۳۰ء، ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء میں مسلسل طور پر کوشش کی گئی کہ پولین کی ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے منتقل کر دی جائیں، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اس طویل عرصہ میں پولین کی شہرت بڑھتی جاتی تھی، جھوٹری میں رہنے والے سے لیکر محلات میں آرام کرنے والے تک اسکے غیر فانی کارناموں سے دلچسپی لینے لگے تھے اور اسکی عظمت و جلالت ہمہ تن استقبال کے واقعات سارے ملک میں مشہور ہو چلے تھے۔ چنانچہ فرانس کے مشہور شاعر و کٹر کے قلم سے بھی یہ الفاظ نکل گئے کہ :-

”تیرے سہارے غرت سے عنقریب بدلیاں دور ہونے والی ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب تیری صاف اور روشن شمایں ہم تک آزادی سے آسکیں گی۔“

لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا اور تکمیل وصیت کی ساعت کسی اور موقع کی منتظر تھی۔

نپولین کے بعد عالم سیاست میں فرانس کی وہ عزت و وقعت باقی نہیں رہی تھی، جو اس کی زندگی میں پائی جاتی تھی، لیکن یہ بھی فطرت کا کس قدر عجیب و غریب طریقہ کار ہے کہ یہی وہ انحطاط تھا جسے پھر ایک بار اہل فرانس میں نئی روح پھونک دی اور پھر نپولین کی محبت اُنکے قلوب میں موجزن کر کے دکھا دی۔ نپولین کے بعد جس قدر زمانہ گزرتا جاتا تھا، فرزند ان فرانس کے جوش ملی میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی حتیٰ کہ جب اس کی ہڈیاں جزیرہ ہیلینا سے ساحل سین پر منتقل کی گئیں، تو فرانس کے حیات قومی کا جو دیکھنا اضطراب بنگیا اور یورپ کے طول و عرض میں یہ صدا گونج اٹھی کہ :-

”نپولین مرنے کے بعد اپنی قوم کو زندہ کرنے آ رہا ہے“

اور جرمنی کا مشہور شاعر مہتری ہینی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ”نپولین کی لاش جزیرہ ہیلینا سے ہماری طرف نہایت باقاعدہ قدم اٹھاتی ہوئی بڑھ رہی ہے، گویا وہ اپنی تہدید آمیز رفتار سے ہمارے مستقبل کو دھمکی دے رہی ہے“

(۲)

جس زمانہ میں نپولین کی وصیت پوری ہو گئی، وہ ایسا زمانہ تھا جب حکومت اور قوم کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے تھے، اور فرانس کی اک بڑی جماعت ”نپولین پرست“ ہو گئی تھی۔ چونکہ قوم کے جذبات بڑی حد تک ناقابل ضبط ہو گئے تھے اور سلطنت کے ارباب حل و عقد نے فرانس کی داخلی و خارجی سیاست سنبھالنے کیلئے اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں دیکھا کہ رعایا کی متفقہ استدعا کو قبول کیا جائے، اسلئے نپولین کی وہ وصیت جو زمانہ دراز سے التوا میں پڑی ہوئی تھی اور جس کی تکمیل کے لئے اہل فرانس اصرار کر رہے تھے، پوری کی گئی اور ملک کے جذبات بڑی حد تک ٹھنڈے ہو گئے۔

جب پہلی مئی ۱۸۴۰ء کی صبح کو، جو شاہ فرانس کے ”عید جلوس“ کی صبح تھی، تمام ذرا وارا کین شاہی محل میں رسم تہنیت ادا کرنے حاضر ہوئے، تو لوئی فلپ (شاہ فرانس) نے صدر اعظم ٹیرس کو مخاطب کر کے کہا کہ :-

”میں اس عید کو خوشی میں آپ لوگوں کے لئے ایک ہدیہ پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہدیہ، یہ ہے کہ نپولین کی لاش اسکے محبوب وطن میں لا کر دفن کی جائے۔ میں پرنس جو انفیل کو اس غرض کے لئے جزیرہ ہیلینا بھیجنا چاہتا ہوں اور تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ اس باب میں وزارت برطانیہ سے مراسلت شروع کر دیا جائے“

اس زمانہ میں موسیو گینزو، فرانس کی طرف سے لندن میں عہدہ سفارت پر مامور تھا۔ چنانچہ اس نے برطانیہ کے وزیر اعظم سے اس مسئلہ کو طے کر کے فرانس کو اطلاع دی اور ۱۲ مئی ۱۸۴۷ء کو فرانس کی مجلس وزارت نے اس خبر کا اعلان کر دیا کہ ”نپولین کی لاش جزیرہ ہیلینا سے فرانس میں منتقل کی جائے گی۔“
ظاہر ہے کہ اس خبر سے اہل فرانس کو کس قدر مسرت ہوئی ہوگی۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں اس اعلان نے شگفتگی و تازگی نہ پیدا کر دی ہو اور کوئی قلب ایسا نہ تھا جو حماست و شجاعت، اور فرانس کی گزشتہ سطوت و جبروت کے خیال سے معمور نہ ہو۔ مجالس تہنیت قائم کی گئیں، محافل طرب برپا ہوئیں اور زندگی کی ایک نئی لہر ذرہ ذرہ میں دوڑ گئی۔

جب تمام مبادیات طے ہو گئے، تو وزارت فرانس نے مصارف کا تخمینہ کیا اور ایک ملین فرانک کی منظوری دی، لیکن جمعیت انتظامی نے، جو اس مقصد کے لئے قائم کی گئی تھی، اس رقم کو نا کافی قرار دیکر ایک ملین فرانک کا اور مطالبہ کیا۔ چونکہ حکومت اس مطالبہ کو پورا نہ کر سکتی تھی، اس لئے چند وکیلے اشتہار دیئے گئے اور لوگوں نے نہایت خوشی سے اس حصہ لیا۔ متبعین نپولین نے تو اپنا اثاثہ البیت تک فروخت کر دیا اور اس مطالبہ کو پورا کرنے کیلئے کوئی دقیقہ کو شش کا نہ اٹھا رکھا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ نپولین کی یادگار کہاں قائم کی جائے۔ بعض نے کنسیئہ ماڈلین تجویز کیا، بعض نے بفتیوں کی راہ دی۔ ایک جماعت نے مارو فندوم کو مناسب سمجھا اور دوسری نے میدان کوئٹورڈ کو۔ آخر کار سب اسپر متفق ہو گئے کہ نپولین کی لاش قصر انفالید میں دفن کی جائے، جہاں فرانس کے بہت سے مفاخر جرمنی (Jérôme) پائے جاتے ہیں۔

اس غرض کے لئے جو جماعت مرتب کی گئی تھی اس میں نپولین کے وہ رفقا بھی شامل تھے، جو اس وقت تک زندہ موجود تھے اور ان کا صدر، پرنس جوئفیل کو قرار دیا گیا۔

۷ جولائی ۱۸۴۷ء کو شام کے سات بجے، یہ جماعت بل پوئل جہاز پر، جو فرانس کا بہترین جنگی جہاز تھا، بندرگاہ تولون سے ہیلینا کی طرف روانہ ہوئی۔

اس سفر کو مسلسل تین ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ ۷ اکتوبر کو دور سے خشکی کا حصہ نظر آیا اور ۹ اکتوبر کو ۱۱ بجے، پرنس جوئفیل اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خشکی پر اترا۔ یہ جماعت سب سے پہلے حاکم جزیرہ کے مکان پر گئی، یہاں انہیں وہ کچھوے دکھائے گئے جو نپولین کے زمانہ سے زندہ چلے آ رہے تھے۔ اسکے

بعد نپولین کی قبر کی زیارت کی اور پھر اس مکان کو دیکھا، جہاں وہ مجبوس تھا۔ اس مکان کی دیواروں پر سٹیکروں
عبارتیں لکھی ہوئی تھیں، جن سے زائرین کے جذبات ظاہر ہوتے تھے۔ ذیل کی ایک عبارت سے ظاہر ہوتا
ہے کہ نپولین کے ساتھ لوگوں کو کس قدر محبت تھی اور اسکی یاد میں لوگ کس درجہ مضطرب تھے:-

”میشل روپور نے جو پہلے پولیس کا سپاہی تھا، صرف اسلئے جہاز اٹلیا کی ملازمت اختیار کی کہ وہ
اپنے کابورل صغیر (مصطفیٰ کمال) کے مکان کی زیارت کر سکے۔ الوداع!“

۱۴ اکتوبر تک یہ جماعت طیاری میں مصروف رہی اور اس تاریخ کی رات کو اپنے محبوب بادشاہ کی
لاش نکالنے روانہ ہوئی۔ آدھی رات کو یہ لوگ اس باغ میں داخل ہوئے، جہاں نپولین مدفون تھا اور صبح
کے وقت پچاس آدمیوں نے اس پتھر کو ہٹایا جو قبر پر رکھا ہوا تھا۔ ۹ بجے صبح کو سب لوگ تابوت دیکھنے
آئے جس کے چار حصہ تھے، پہلا لکڑی کا، دوسرا سیسے کا، تیسرا پھر لکڑی کا اور چوتھا جست کا۔

جب تابوت کھولا گیا، تو سب نے دیکھا کہ جسم کے اوپر بڑی مقدار میں روئی رکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر نے جو
جمعیت کے ساتھ تھا، پاؤں کی طرف سے روئی لپٹنی شروع کی اور تھوڑی دیر بعد حاضرین پر یکایک خوف
کے آثار نمودار ہو گئے، کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ جسم حرکت کر رہا ہے! لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ یہ حرکت جسم کی
نہیں ہے بلکہ ان بیش قیمت کپڑوں کی ہے، جن میں نپولین کا جسم ملفوف ہے۔

جب پورا جسم ظاہر ہوا، تو لوگوں نے دیکھا کہ اس طویل مدت نے اسکے جسم میں کوئی غیر معمولی تغیر پیدا
نہیں کیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نپولین سو رہا ہے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس منظر کو اسطرح
بیان کیا ہے:-

”نپولین کے نقوش میں کوئی قابل ذکر تغیر واقع نہیں ہوا تھا، سوائے اسکے کہ ناک کے نیچے کا حصہ

”کچھ بگڑ گیا تھا اور رخساروں میں کچھ فرق پیدا ہو گیا تھا جس سے اسکے گندمی رنگ میں

زیادہ سیاہی نمودار ہو گئی تھی۔ سر منڈا ہوا تھا، آنکھیں بند تھیں، ہونٹوں کی کیفیت جسم طاری

”تھی، سینہ بہت سے تمنے تھے اور دونوں پاؤں کے درمیان دو طرف رکھے ہوئے تھے جن

”میں سے ایک میں اسکا دل رکھا ہوا تھا اور دوسرے میں اسکا معدہ۔“

۱۵ فوجی لوگ نپولین کو اسی نام سے پکارتے تھے۔

جب سب لوگ اس موثر منظر کو دیکھ چکے، تو تابوت بند کیا گیا اور ۳۴ آدمیوں کی مدد سے اُسے گاڑی پر رکھ کر جہاز کی طرف لگئے۔ جب لاش جہاز پر پہنچی تو تین سو ضرب توپ سلامی میں سر کی گئیں۔

۱۸ اکتوبر کو جہاز بل پول نے لنگر اٹھایا۔ دو فرانسیسی جہاز اور اسکے جلو میں تھے۔ راستہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا، سوائے اسکے کہ مسافر یہ خبر سن کر بہت پریشان ہوئے کہ فرانس کی سیاسی حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور وہ بھی دیگر دول یورپ کے ساتھ مسئلہ شرقیہ کے سلسلہ میں شریک جنگ ہونے پر مجبور ہے۔

۲۹ نومبر کو جہاز، بندرگاہ چر برگ میں لنگر زن ہوا اور کال آٹھ دن اسے انتظار کرنا پڑا، کیونکہ جلوس کی طیاریاں، اس وقت تک مکمل نہ ہوئی تھیں۔ آٹھ دن کے بعد، لاش بل پول سے اتار کر، جہاز نارمنڈی میں رکھی گئی، جو اُسے لیکر پاور کی جانب روانہ ہوا (جو نہر سین کے دہانہ پر واقع ہے) پاور پہنچنے پر لاش ایکس جہوٹی کشتی پر رکھ کر نہر سین کے راستہ سے پیرس کی طرف روانہ کی گئی۔

جب ۱۲ دسمبر کو یہ لاش پیرس پہنچی، تو اس وقت سردی کا یہ عالم تھا کہ تھرمائیٹر، صفر سے ۱۴ درجے نیچے اتر آیا تھا، لیکن اہل فرانس کے ذوق و شوق کی کیفیت تھی کہ آدھی رات سے انھوں نے اس مہمان عزیز کی پذیرائی کی طیاریاں شروع کر دی تھیں اور طلوع آفتاب سے قبل سب لوگ قصر انفالید پر پہنچ گئے تھے۔

باجے بج رہے تھے، ترانے گائے جا رہے تھے، توپیں سرور ہی تھیں، کنائس کے گھنٹے شور کر رہے تھے، راستے ہجوم کیلئے تنگ ہو گئے تھے، کھڑکیوں اور دروازوں پر سیاہ پردے لٹک رہے تھے، اور سب لوگ نعرہ لگا رہے تھے :-

”پولین پائندہ باد، شہنشاہ زندہ باش“۔ لاش ایک گاڑی پر رکھی ہوئی تھی، جسے سولہ گھوڑے کھینچ رہے تھے اور تابوت کو ”معبودہ نصرت“ کے چودہ طلائی محسمے اٹھائے ہوئے تھے۔

پردگراں میں لکھا تھا کہ وزیر اور ممبرانِ بلدیہ کے بعد، جلوس میں ان فوجی لوگوں کی جماعت ہوگی، جو پولین کے ساتھ رہا کرتے تھے، لیکن ان لوگوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے پردگراں کی مطلق پرواہ نہیں کی اور سب سے پہلے وہی لاش کے گرد ہو گئے۔

قصر انفالید کے میدان میں تماشائیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ شام کو بے شمار ٹوپیاں، رومال، کبل وغیرہ وہاں سے اٹھائے گئے۔

(۳)

یہ ہیں وہ لمحات تاریخی جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات انسانی کیونکر خلعتِ دوام حاصل کر لیتی ہے، اور قلبِ دماغ کا وہ کونسا تاثر ہے، جو اس کے فکر و ادراک کو غیر فانی بنا جاتا ہے۔
 یقیناً، نپولین کی لاش ساحلِ سین پر منتقل نہیں کی گئی، بلکہ اس ملکی غیرت و خودداری، اس ملی سطوت و جبروت کو محفوظ کر دیا گیا، جسے حیاتِ قومی کی پیش نبض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
 فرانس میں مشکل سے مہیں کوئی ایسا آدمی ملیگا، جو قبرِ نپولین کے پاس سے گذرتا ہو اور قومی جوش سے اس کے خون میں حرارت نہ پیدا ہو جاتی ہو۔ ہندوستان میں لاکھوں ایسے نشانات ہیں، جو ہماری غیرت و خودداری کو حرکت میں لانے کے لئے اپنی موثر ترین مسامرایاں پیش نظر کرتے رہتے ہیں، لیکن انہیں دیکھ کر ہمارا دل اور گھج جاتا ہے۔
 فرانس کا باشندہ، نپولین کی قبر کا ذکر جس پندار کے ساتھ کر سکتا ہے، اسی غرور کے ساتھ ہم بھی تاجِ راکرے کا نام لے سکتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ فخر اک صداقت ہے بر ملا، اور یہ پندار اک کذب ہے، لغو و دوراز کارا۔

نیاز

غزل

بیاختہ اک اُف میرے منہ سے نکلی گئی
 گویا میرے خیال کی دنیا بدل گئی
 جب دل ٹھہر گیا تو طبیعت سنبھل گئی

ہنگام دید دل کی یہ حالت بدل گئی
 دیکھا ہے جب اُنکو کچھ عالم ہی اور ہے
 تھی میرے واسطے حرکتِ قلب کی مضر

مرزا محمد صادق علیخان نظر

عجم کے کارنامے

اسلام کے عہد زریں میں

اگر خالص مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے، تو کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حقیقی معنی میں اسلام کا عہد زریں تو وہی تھا جب تک بانی اسلام اس عالم آب و گل میں بقید حیات رہا، لیکن اگر اس خیال سے قطع نظر کر کے، علوم و فنون کے ارتقار، مدنیت و حضارت کے عروج کو پیش نگاہ رکھا جائے، تو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ زمانہ ۱۲۲ھ سے شروع ہوتا ہے۔ جب عہد عباسیہ کا اولین فرمانروا خلیفہ رونما ہوا اور پوری ایک صدی کے بعد ۲۳۲ھ پر ختم ہو جاتا ہے۔ جب قدرت نے عنان خلافت، متوکل (دسویں خلیفہ) کے سپرد کی۔

جن لوگوں نے تاریخ کا سرسری مطالعہ کیا ہے، وہ بھی اس سے واقف ہوں گے کہ خلافت عباسیہ کی بنیاد صرف ایرانی النسل لوگوں کی مدد سے قائم ہوئی اور انہیں کی اعانت و مشورت نے اس خاندان کی حکومت کو انتہائے عروج تک پہنچا دیا۔

اس میں شک نہیں کہ بنو امیہ نے نہایت اہتمام و شان کے ساتھ حکومت کی، فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہو گیا، اور اسلام میں مادی دولت کا بھی کافی اضافہ ہوا، لیکن بنو امیہ کی حکومت خالص عربی النسل لوگوں کی حکومت تھی، اور چونکہ اعراب، فطرت کی طرف سے درشت و خشن طبیعت لیکر آئے تھے، اسلئے باوجود بنو امیہ کی وسعت فتوحات و ملک گیری کے ان کی طبائع میں وہ لچک پیدا نہیں ہوئی جو حضارت و تمدن کے لئے ضروری ہے اور جس سے یہ لوگ بالکل نا آشنا تھے۔

جب بنو عباس کی خلافت کے ساتھ ساتھ، ایرانی اثر نظام حکومت میں غالب ہونے لگا اور عربوں کا اقتدار کم ہونے لگا، تو تمام وہی خصوصیات جو کسی وقت اکاسرہ عجم کی حکومت میں پائی جاتی تھیں، آہستہ آہستہ ان میں بھی پیدا ہونے لگیں، علوم و فنون کی طرف توجہ، تمدن و معاشرت کے لوازم کی فراہمی، ظاہری شان و شوکت، معاشرت کی رفعت و پاکیزگی، مذہبی وسعت نظر،

یہ سب وہ باتیں تھیں جو اس زمانہ میں پیدا ہوئیں۔ آل برکٹ نے دربار خلافت میں جو اثر اپنا پیدا کر لیا تھا وہ حقیقتاً اک انتقام تھا جو عجم سرزمین عرب سے لے رہا تھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی آخری حد کیا ہوتی، اگر درمیان میں ترکوں کی جماعت اس اثر کو مٹا کر ہوا کا رخ ہی نہ بدلتی۔

ایرانیوں یا آل برکٹ کے اقتدار کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ دربار خلافت، علمی جلووں سے معمور ہو گیا اور ایک گروہ ایسے علماء کا پیدا ہو گیا جو نقل و نقل کو مطابق کرنا چاہتا تھا اور جسے اب معتزلہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، معتزلہ نے کیا کیا، کس حد تک انہوں نے اسلام کی خدمت ادا کی، اپنے اخلاق و اصول کے لحاظ سے یہ لوگ کیسے تھے، اسکے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، یہاں مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر معتزلہ کا وجود نہ ہوتا، تو اسلام فطری مذہب ہونے کے لحاظ سے لوگوں کی نگاہوں سے گر گیا ہوتا اور اک الہامی دین کی حیثیت سے اسکو نہایت سخت آزار پہنچ جاتا، لیکن ترکوں کے عروج کے ساتھ ہی ایک طرف ایرانیوں کا اثر دربار خلافت سے کم ہو گیا اور دوسری طرف وہ مذہبی و علمی ترقی جو معتزلہ کی وجہ سے ہو رہی تھی دفعتاً رک گئی اور آہستہ آہستہ اس کی جگہ انہیں اصول نے لے لی، جو صرف اک مسلمان ہی کے سامنے پیش کئے جاسکتے ہیں اور جنہیں وہی شخص تسلیم کر سکتا ہے جو پہلے سے اسلام کا ماننے والا ہو۔

ہم یہ ابھی بیان کر چکے ہیں کہ خلافت عباسیہ کی بنیاد ہی ایرانی ہاتھوں سے پڑی، اسلئے اگر اس عہد میں ان کا اثر غالب ہو گیا، انکو امور سلطنت میں زیادہ درخور حاصل ہو گیا، تو جائے عجب نہیں، **۱۔** برکت حقیقتاً کسی شخص کا نام نہ تھا بلکہ یہ اک لقب تھا جس سے پنج کے مشہور آتشکدہ نو بہار کا محافظ پکارا جاتا تھا۔ سعودی کا بیان ہے کہ وہ شخص، جسکے سپرد یہ خدمت ہوتی تھی، بے انتہا معزز و ممتاز خیال کیا جاتا تھا۔ اور جو دولت، ہدایا کی صورت میں جمع ہوتی تھی اسکا بھی انتظام اسی کے سپرد ہوتا تھا۔

قرظینی نے بھی آثار البلاد میں لکھا ہے کہ ترک اور ایرانی اس آتشکدہ کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ آتشکدہ کی لمبائی اور چوڑائی سو سو ہاتھ تھی اور بلندی اس سے کچھ زائد۔ اسکی حفاظت براہمہ کے سپرد تھی، ہندوستان اور چین کے بادشاہ بھی یہاں آتے تھے اور برکٹ کے ہاتھوں کو بوسہ دیکر پرستش میں مصروف ہوتے تھے۔

یہ آتشکدہ اسوقت ٹھنڈا ہوا جب حضرت عثمان غنی کے عہد میں خراسان فتح ہوا۔ اسوقت خالد کا باپ یہاں کا برکٹ (یعنی محافظ) تھا۔

کیونکہ خلفائے عباسیہ قدرتی طور سے اُن کی پاسداری پر مجبور تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے اہل بھی تھے۔

یوں تو عہدِ عباسیہ کے اول خلیفہ، سفاح ہی کے وقت سے ایرانیوں کا اثر اور اسکے ساتھ اُن کی روشن خیالیاں نمایاں ہو چلی تھیں، لیکن اسکا شباب خلیفہ مامون کے عہد میں آیا، جسکی ماں اور بیوی دونوں ایرانی النسل تھیں، ہر چند خاندانِ برمک قریب قریب بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ لیکن ایران کا ایک دوسرا خاندان اور موجود تھا، جس نے اسکی جگہ لے لی اور عربوں کو، جو مامون کے خلاف، امین کی طرف سے اک قسمت آزما جنگ کر چکے تھے، بدستور دربار خلافت سے الگ ہی رکھا۔

خلیفہ کے بعد سب بڑا درجہ وزیر کا تھا اور وہ اس عہد میں قریب قریب ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں رہا۔ عہدِ عباسیہ سے قبل وزیر کا وجود نہ تھا بلکہ اسکے بجائے ایک شخص کا تب یا مشیر کے نام سے موسوم ہوتا تھا، جو قریب قریب ہی خدمت انجام دیتا تھا۔ سب سے پہلے عہدِ عباسیہ ہی میں وزیر کا عہدہ ایجاد کیا گیا اور اسکے فرائض مقرر کئے گئے۔

ہر چند یہ عہدہ قریب قریب ایرانیوں ہی کے ہاتھ میں تھا اور انہوں نے نہایت قابلیت سے اس خدمت کو انجام دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تھا حد درجہ خطرناک۔

چنانچہ ابو مسلم جسے امین آل محمد کہتے تھے، جس بُری طرح قتل کیا گیا، تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور ابو مسلم سے قبل جو وزیر (ابو سلمہ) تھا، اُسے خود ابو مسلم نے سفاح کے حکم سے جس بُری طرح ہلاک کیا

۱۵۔ اسکا نام پوران تھا جو حسن بن سہل کی بیٹی اور فضل بن سہل (مامون کے وزیر) کی بھتیجی تھی۔ ابن خلکان اور ثعالبی نے تفصیل کے ساتھ اس شادی کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت تمدن و معاشرت ارتقار کے کس درجہ پر تھے۔ اور نمود و نمائش، شان و شوکت کس حد تک پہنچ گئی تھی۔

مامون کی ماں کا نام مراحل تھا جو، ہرات کی رہنے والی تھی۔ اور بصورتِ کینز، ہارون الرشید کے حرم میں داخل تھی۔ ۱۶۔ اس لفظ کا ماخذ عام طور سے ذکر بتایا جاتا ہے چونکہ انتظامِ سلطنت کا تمام بار اسی عہدہ دار کے ذمہ ہوتا تھا اسلئے اُسے وزیر (بوجہ اٹھانے والا، ذمہ دار) کہتے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ عرب ہے پہلوی لفظ وچیر کا مشتق ہے وہی جر، (فصلہ کرنا) سے یا گزیر کا جو تالمود میں پایا جاتا ہے۔ علامہ فخری کا بیان ہے کہ وزیر کا اشتقاق وزیر سے بھی ممکن ہے جسکے معنی ہیں جائے پناہ کے۔

وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ ابو مسلم کے بعد ابوالجہم وزیر ہوا اور اس کو بھی خلیفہ نے زہر دیا۔ جب اسپر زہر کا اثر شروع ہوا اور وہ کمرہ سے اٹھ کر چلا تو خلیفہ نے پوچھا، ”کہاں چلے؟“ اُس نے جواب دیا جہاں آپ مجھے بھیجا چاہتے ہیں۔“

اس وزیر کے بعد آل برک کا عروج ہوا اور نصف صدی تک اس طغتنہ کے ساتھ انہوں نے وزارت کی کہ تاریخ مشکل سے کوئی دوسری مثال پیش کر سکتی ہے۔ لیکن باوجود اس تمام اقتدار و اثر کے یہ بھی نہایت احتیاط سے اور ڈرتے ہوئے کام کرتے تھے کہ مبادا اُن سے کوئی حرکت ایسی سرزد ہو جائے جس سے اُن پر نجوسی الاصل ہونے کی وجہ سے تعصب کرنیکا الزام عاید ہو۔

ایک بار خلیفہ منصور نے ابو ایوب کے مشورہ سے ارادہ کیا کہ ایوان کسری کو منہدم کر کے اُس کے سامان سے دوسرا قصر طیار کرائے۔ جب خالد بن برک سے ذکر آیا تو اُس نے کہا کہ ”امیر المؤمنین، ایسا نہ کیجئے، کیونکہ اسکو قائم رکھنا حقیقتاً اسلام کے نشان اقبال کو قائم رکھنا ہے۔ آئندہ نسلیں حب دیکھیں گی تو کہیں گی کہ کیسی کیسی سلطنتیں مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھیں، علاوہ اس کے یہ وہ مکان ہے جہاں علی ابن ابی طالب نے نماز ادا کی ہے۔ لیکن اگر یہ باتیں قابلِ لحاظ نہ ہوں تو بھی اسکا مسمار کرنا اقتصادی نقطہ نظر سے مفید نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے برباد کرنے میں جس قدر صرف ہو جائے گا، اس سے کم میں اک نئی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔“ منصور نے یہ سن کر جواب دیا کہ ”اے خالد، جب تو کوئی بات کہتا ہے تو ہمیشہ اس سے ایران کی پاسداری ظاہر ہوتی ہے۔“

خالد یہ سن کر خاموش ہو گیا اور منصور نے مسماری کا حکم دیدیا، لیکن چند دن بعد ہی منصور کو معلوم ہو گیا کہ اسکے ٹوڑنے میں اندازہ سے بہت زیادہ صرف ہو رہا ہے اور خالد کا خیال صحیح تھا۔ اس لئے ایک دن اُس نے خالد سے کہا کہ ”میں بھی تمہاری رائے سے متفق ہوں اور ایوان کسری کی مسماری کو میں نے بند کر دیا ہے۔“ خالد نے یہ سن کر کہا کہ ”امیر المؤمنین، اب اسکا مٹا دینا ہی مناسب ہے، کیونکہ جب آئندہ قومیں اسے نیم شکستہ حالت میں دیکھیں گی تو کہیں گی کہ خلیفہ منصور اس چیز کو بگاڑ بھی نہ سکا، جس کو ایک قوم نے بنایا تھا۔“ ہر چند خالد کی دونوں رائیں صائب تھیں لیکن منصور نے کسی پر عمل نہیں کیا۔

الغرض عمدہ وزارت، اُس زمانہ میں بے انتہا نازک تھا لیکن باوجود تمام خطرات و خدشات کے ایرانیوں نے اس جگہ کو ہاتھ سے نہیں دیا اور آہستہ آہستہ اُن کی تہذیب و معاشرت نے عربوں میں

رسوخ حاصل کر لیا۔ پہلے مسلمانوں میں جشنِ نوروز کا رواج نہیں تھا، لیکن عہدِ عباسیہ میں ہر شمس سال کے پہلے دن جب آفتاب بُرجِ حمل میں جاتا ہے، یہ جشن منایا جاتا تھا۔

خلیفہ ہادی، ہارون اور مامون کے عہد میں ایرانیوں کے اثرات انتہائے عروج تک پہنچ گئے تھے اور مامون کے تو اکثر وزیر ایرانی یا ایرانی النسل تھے۔ بغداد میں ایرانی وضع عام ہوتی جاتی تھی۔ نوروز، مهرگان اور رام کی ایرانی تقریبات نہایت اہتمام سے عمل میں آتی تھیں۔ درباری لباس بھی ایرانی تھا حتیٰ کہ کوئی شخص بغیر قلنسوہ (مخروطی شکل کی لابی سیاہ ٹوپی) کے خلیفہ کے حضور میں آہی نہ سکتا تھا۔ ساسانی بادشاہوں کے بہت سے آداب داخل دربار ہو گئے تھے۔ خلیفہ المتوکل کا ایک سکہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل ساسانی لباس میں رہا کرتا تھا۔

پھر ایرانی اثر صرف انتظامی معاملات سلطنت تک محدود نہ تھا بلکہ علوم مذہبیہ میں بھی یہ لوگ صفِ اول میں شمار کئے جاتے تھے۔

عہدِ جاہلیت میں، عرب لکھنے پڑھنے سے بالکل ناواقف تھے اور انہیں اپنے امی ہونے پر ناز بھی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی شاعری اور فخرِ انساب اک ایسی بڑی دولت اُن کے پاس ہے کہ اسکے ہونے ہوئے دنیا میں پھر کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اُن کا خیال تھا کہ جو شخص شاعری کے علاوہ کسی اور فن یا علم کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ اپنے حقیقی فخر کو ضائع کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ جو قوم اپنے تیر و کمان، نیزہ و تلوار سے کام لینا جانتی ہے اُسے کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہ اپنے قوم کی پُرانی تاریخ اور اپنے خاندان کے قدیم انساب کو محفوظ رکھے۔

رسول اللہ کے مبعوث ہونے کے بعد بھی عربوں کا یہی حال تھا اور وہ مطلقاً تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ یہی کمی تھی جب کا خیال کر کے رسول اللہ نے جنگِ بدر کے قیدیوں کے متعلق یہ حکم دیا تھا کہ اُن میں سے لکھنا جانتے ہیں وہ آزاد ہیں، بشرطیکہ قریش کے بچوں کو لکھنا سکھائیں۔ واقدی کے حوالہ سے بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ ابتدائے اسلام میں قریش کے امرا میں سے

۱۔ ذوالرمہ (جو قدیم بدوی شعرا کی آخری گڑھی تھا) لکھنا جانتا تھا، لیکن اس نے ہمیشہ اس حقیقت کو چھپایا، کیونکہ عربوں میں فنِ تحریر کا جاننے والا لنگا ہوں سے گرجاتا تھا۔

صرف ۱۰ آدمی لکھنا جانتے تھے جن میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عثمان، ابن الجراح، طلحہ، ابوسفیان، اور امیر معاویہ بھی شامل تھے۔

برخلاف اس کے ایرانیوں کی یہ حالت تھی کہ قدیم ساسانی عہد میں ہی کوئی بادشاہ اس وقت تک مکمل طور سے سلطنت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک وہ فنِ تحریر سے واقف نہ ہو۔ پھر ہی نہیں تھا کہ وہ صرف اپنی مادری زبان پر عبور رکھتے ہوں بلکہ (ظہور اسلام سے قبل ہی) وہ عربی زبان بھی حاصل کرتے تھے چنانچہ ہر ام گور جس کی تعلیم اعرابِ خیرہ کے درمیان ہوئی تھی، علاوہ عربی، فارسی کے یونانی زبان بھی جانتا تھا اور ان تمام زبانوں کو اچھی طرح لکھ بھی سکتا تھا۔ عوفی نے تو اس کے عربی شعر بھی اپنے تذکرہ میں درج کئے ہیں۔ اسی طرح ایرانی گورزِ زمین کا (خراسرو) تو بالکل عرب ہی بن گیا تھا اور آری وجہ سے وہ اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا۔ الغرض ایرانی پہلے ہی سے عربی زبان سے مانوس تھے اور حبیب اسلام نے عرب و عجم کو ایک کر دیا، اور اختلافِ مذہب بھی مٹ گیا تو پھر کثرت سے انہوں نے عربی زبان حاصل کی اور اس قدر معرفت کے ساتھ وہ عربی سانچہ میں ڈھل گئے کہ مشکل سے کوئی دوسری نظیر صفحات تاریخ پر مل سکتی ہے۔

پہلی صدی ہجری ختم نہ ہوئی تھی کہ عجم نے عربی زبان کے نجوی اور سرفی پیدا کر دیئے، چنانچہ پیش گست (ایرانی) سب سے پہلے وہ شخص تھا جس نے مدینہ میں بیٹھ کر عربی زبان کے قواعد مرتب کئے۔ اگر ان قابل لوگوں کی فہرست مرتب کی جائے جو اسلام کے قرونِ اولیٰ میں پائے جاتے تھے تو اس میں اکثر نام عجمی لوگوں کے ہونگے جو جنگی قیدی کی صورت سے عرب آئے اور موالیٰ کی حیثیت سے اسلام کی نہایت عمدہ خدمات انجام دیں۔ ابواسحاق کا دادا، جس کی سیرت نبوی، ابتدائے اسلام کی بہترین تاریخ ہے۔ ابوموسیٰ نصیر جو تاریخِ اندلس کا خاص شخص ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ جنہوں نے ادب و حکمت، سیاست و مذہب کے علوم میں مخصوص شہرت حاصل کی، سب کے سب ایرانی یا ترکی نسل کے تھے، جو بحیثیت موالیٰ کے عرب میں رہتے تھے۔ خلیفہ عبد الملک اور فقیہ الزہری کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ، یمن، مصر، شام، عراق، خراسان، کوفہ، اور بصرہ میں ہر جگہ عمدہ قضا موالیٰ ہی کے ہاتھ میں تھا اور کسی عرب کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ چنانچہ خلیفہ کو اس پر تعجب ہوا تو الزہری نے جواب دیا کہ ”امیر المؤمنین یہ تو خدا اور اس کے مذہب کی پیروی

کا نتیجہ ہے جو مذہبی احکام پر عامل ہو گا وہی ترقی کر سکے گا۔

اس میں شک نہیں کہ عرب نے ہمیشہ عجم سے نفرت کی اور باوجود اسکے کہ مذہب نے ان دونوں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا اور تفریق قومی کو یکسر مٹا کر رکھ دیا تھا، تاہم اہل عرب نہ اہل عجم سے خوش تھے اور نہ ان کے ساتھ اپنے تعلقات وسیع کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کا کیا علاج کہ موالی عجم اپنے فہم فراست، اپنی قابلیت و ذہانت سے آہستہ آہستہ ترقی کرتے جا رہے تھے اور عہد نبو اتمیہ میں بھی جو خالص عربی حکومت کا دور تھا، انہوں نے نمایاں امتیاز حاصل کر لیا تھا اور زمانہ کی رفتار کھے دیتی تھی کہ وہ دن بہت جلد آنے والا ہے، جب عجم، عرب کو پس پشت ڈال کر خود بروئے کار آ جائیگا۔ چنانچہ عہد عباسیہ میں یہ نتیجہ ظاہر ہو کر رہا اور ایرانیوں کے غیر معمولی عروج نے عربوں کو آتش زیر پا کر دیا۔ چونکہ عرب کو اپنے نسب پر بڑا فخر تھا اور وہ غیر اعراب پر طعن و تشنیع سے باز نہ آتے تھے، اس لئے ان کے مخالف ایک اور گروہ نشوونما پیدا ہو گیا، جس نے نہ صرف یہ دعویٰ پیش کیا کہ مذہب اسلام نے تمام قوموں کو برابر کر دیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عربوں کی قوم اکثر قوموں سے کمتر درجہ کی ہے۔

ایک بار ابوتام نے خلیفہ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا جس میں اسے قبیلہ طے کی مشہور ہستی حاتم سے تشبیہ دی تھی۔ وزیر نے سکر شاعر کو تنبیہ کی کہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرنا کہ امیر المومنین کے مقابلہ میں وحشی عربوں کا ذکر کرو۔

شعوبہ گروہ کی مختلف جماعتیں تھیں اور ہر جماعت اپنے اپنے ملک کی طرفداری کرتی تھی، لیکن ان میں سب سے زیادہ ذمی اثر ایرانی جماعت تھی۔ اس عہد کے امرا ایران اپنے نسب ناموں کو بھی اسی طرح محفوظ رکھتے تھے جس طرح عرب۔ اور اس لئے شعوبہ جماعت نے اس باب میں بھی عربوں پر حملہ کیا، جو زیادہ بجا نہ تھا اور اگر اس خصوصیت کو نگاہ رکھا جائے کہ وہ عربوں کے انساب کا بھی کافی علم رکھتے تھے بلکہ بعض اوقات خود عربوں کو اپنے آبا و اجداد کے تاریخی حالات ایرانیوں سے دریافت کرنے پر طے تھے، تو ایرانیوں کا یہ فخر بالکل حق بجانب نظر آتا ہے۔

ایرانی بے انتہا ذہین تھے، وہ سمجھتے تھے کہ عربوں میں کیا کنز و باں ہیں اور وہ ان سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ذوق اس قدر بڑھ گیا کہ مختلف کتابیں عربوں کی تحقیر و تذلیل میں لکھی

گئیں اور شعو بیہ جماعت نے عربوں کو سخت پریشان کر دیا۔ اسحاق بن حسان الحزمی، ابو عثمان، سعید بن حمید بن بختگان، ابو سعید الرستمی اور ابو ریحان بیرونی خاص خاص لوگ شعو بیہ جماعت کے تھے جنہوں نے عربوں کے خلاف مستقل تصانیف مرتب کر دیں۔

شعو بیہ جماعت کی یہ جنگ صرف انساب اور زبان کے معاملے تک محدود تھی، کیونکہ ان ہی دونوں باتوں پر عربوں کو فخر حاصل تھا اور اگر انصاف کیا جائے تو اس جنگ میں بھی ایرانی ہی کامیاب ثابت ہوئے۔ اسکا بڑا سبب یہ تھا کہ ایرانی، عربوں کی قدیم تاریخ سے پوری طرح واقف تھے اور انہیں معلوم تھا کہ اسمیں کہاں کہاں کمزوریاں پائی جاتی ہیں، چنانچہ انہیں کو وہ نمایاں کر کے دکھاتے تھے برخلاف عربوں کے کہ وہ ایرانیوں کی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے اور انکے پاس کوئی ذریعہ ایرانیوں کو زک دینے نہ تھا۔

شعو بیہ میں ابو عبیدہ معمر بن المثنی نہایت قابل اور شہور شخص گذرا ہے جس نے بتایا ہے کہ عربوں کی زبان کس حد تک ایران کی ممنون ہے، اور انہوں نے ایرانی فسانوں، ایرانی اصول فصاحت و بلاغت سے کس قدر استفادہ کیا ہے۔ حمزہ اصفہانی نے تو اسمیں اس قدر غلو کیا ہے کہ وہ بہت سے عربی شہروں کے ناموں کو بھی فارسی زبان سے ماخوذ بتاتا ہے مثلاً بصرہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ اصل میں یہ بس راہ (دور کا راستہ) تھا اسی طرح صاحب دشتاں نے مکہ کی حقیقت ماہ گاہ (چاند کی جگہ) ظاہر کی ہے۔

بہرچند اس قسم کی تاویلیں بالکل ساقط الاعتبار ہیں لیکن اس سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ شعو بیہ نے عربوں کے خلاف کس قدر شدت و تصعب سے کام لیا۔ اور یہ غالباً انتقام تھا عربوں کے اس نخوت و پندار کا جو وہ عجمیوں کے مقابلہ میں ظاہر کیا کرتے تھے۔

شعو بیہ کے خلاف عربوں نے بہت کچھ لکھا، کتابیں تصنیف کیں، اپنے دغاوی پیش کئے ایرانیوں کے الزامات کا جواب دیا اور پوری طرح اپنی قوت ہجو بازی صرف کر دی، لیکن جب قدر شہرت شعو بیہ کو حاصل ہوئی وہ انہیں نصیب نہ ہوئی اور اس کی وجہ سے صرف یہ تھی کہ ایرانیوں میں علوم و فنون کا رواج تھا اور وہ اپنے وسیع الذرائع ہونے کے وجہ سے مقابلہ زیادہ کامیاب ہوئے۔

جب اسلام کی فتوحات میں وسعت پیدا ہونے لگی اور دیگر ممالک کے لوگ دائرہ اسلام میں

داخل ہوئے تو سب سے پہلے جس چیز کی طرف انہیں توجہ کرنے کی ضرورت ہوئی وہ عربی زبان تھی، کیونکہ وہ قوم جس میں آکر شامل ہوئے وہ کتاب جس کے ساتھ انہوں نے اپنی ساری زندگی وابستہ کر دی، عربی زبان سے متعلق تھی اور اسلئے ضروری تھا کہ وہ پہلے اس زبان میں پوری مہارت حاصل کرتے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایک غیر قوم کو عربی زبان سیکھنے کے لئے صرف و نحو جاننے کی ضرورت تھی اور اس کے ساتھ اس کی لغات معلوم کرنے کی۔ لیکن چونکہ عربی زبان بہت وسیع زبان ہے اس لئے اسکے لغات و قواعد سیکھنے کے لئے قدیم اشعار کا فراہم کر کے یاد کرنا ضروری ہوا اور عربی شاعری سمجھنے کے لئے ان کے انساب و اخبار اور ان کی گزشتہ تاریخ کا علم لابد تھا اس لئے زبان عربی سیکھنے کے ساتھ ہی ساتھ غمبیوں کو صرف و نحو، لغت و تاریخ، علم الانساب والا یام، جغرافیہ و تاریخ کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی جسکی عربوں کو چنداں ضرورت نہ تھی۔

اسی کے ساتھ جب آپ مذہب کی طرف آئیں گے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن سمجھنے اور احکام مذہب کے متعلق اقوال رسول اللہ کا استقصا کرنے کی غرض سے، اصحاب رسول اللہ اور تابعین سے استمداد کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ عام معاشرت کے متعلق رسول اللہ کو فرمان بتائیں، لیکن چونکہ ہر حدیث کو حدیث نبوی ماننے میں تامل ہو سکتا تھا، اس لئے ہر حدیث کی اسناد طلب کی جائے لگیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ اسماء الرجال کا فن مدون ہو گیا، جس کا اضافہ شعبۂ تاریخ میں صرف مسلمانوں نے ہی اول بار کیا اور آج تک کسی مذہب و تاریخ میں اسکی مثال نہیں مل سکی۔

پہلی صدی ہجری میں کوئی کتاب ایسی مرتب نہ ہوئی تھی جو زبان و تاریخ سیکھنے والوں کو مدد دے سکتی اس لئے جن کو عربی لٹریچر سیکھنا ہوتا تھا وہ بدویان صحرائین کے پاس جاتے تھے اور جنہیں احکام مذہب معلوم کرنا ہوتے تھے وہ مدینہ میں اصحاب رسول اللہ کی تلاش کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلب علم کیلئے مسلمانوں کو سفر و سیاحت زیادہ کرنی پڑی اور آخر کار یہ ذوق و شوق اس قدر بڑھ گیا کہ کچھ آل نے جو ایک مصری غلام تھے تمام حجاز، عراق، اور شام کا سفر صرف اس لئے کیا کہ مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق رسول اللہ کی کوئی صحیح حدیث معلوم کریں۔ اور آخر کار زیادہ بن جابر التمیمی سے انہیں ایک حدیث ایسی دستیاب ہوئی جو حبیب بن مسلمہ الفہری سے روایت کی گئی تھی۔

اس کے ساتھ ایک وقت یہ بھی تھی کہ تمام مذہبی علوم صرف زبانی حاصل کئے جاتے تھے۔ چنانچہ

سب سے قدیم مذہبی کتاب کی شرکی، صرف ابن اسحاق کی سیرۃ نبوی تھی جسے ابن ہشام نے زیادہ مہذب مکمل صورت میں پیش کیا۔

پہلی صدی ہجری میں ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر ابن العاص، الزہری، حسن بصری وغیرہ چند نفوس ایسے تھے جنہوں نے اپنی معلوت کو نوٹ کی صورت میں مرتب کیا تھا، لیکن مرتے وقت وہ انہیں ہی تلف کر گئے۔ احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے انحراف دوسری ہجری تک برابر قائم رہا چنانچہ عبدالرحمن بن ہریرہ السلی کو مشکل سے اُن کے استاد نے اجازت دی کہ وہ احادیث کو لکھیں۔ اس قدغن کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لوگوں کا خیال تھا، ممکن ہے کہ کتب احادیث کی ایسی عزت نہ کی جائے۔ جس کی وہ مستحق ہیں اور دوسرا سبب یہ تھا کہ کہیں لوگ صرف احادیث ہی کو اپنا معمول بنا کر کلام مجید کو نہ چوڑ بیٹھیں۔

یہ خیال صرف مذہبی کتابوں سے متعلق تھا ورنہ دیگر فنون کی کتابیں عہد بنو امیہ میں مرتب ہو چکی تھیں اور اکثر لوگوں نے اس طرف کافی توجہ صرف کی تھی۔ ان میں سے وہب بن مُبَہّر (ایرانی النسل) عبید بن شریہ ابو المخنف بن یحییٰ، الزہری ان کے شاگرد عبدالرحمن العامری موطا کا مصنف اسد بن موسیٰ بن ابراہیم، محمد بن شیریں کتاب الجوامع کا مصنف محمد بن علی بن عمرو السالمی کتاب الاشارہ کا جامع خالد بن یزید (اموی شاہزادہ) علم الکیمیا کا ماہر اور اس کا شاگرد جابر بن حیان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

یہ مصنفین عہد بنو امیہ کے تھے لیکن عہد عباسیہ میں انکی تعداد بہت بڑھ گئی اور ان میں عنصر غالب ایرانی النسل لوگوں کا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عجم نے عرب کی کس قدر خدمت کی ہے، چنانچہ ابن المقفع (جو جوہر النسل تھا اور ابن خلدون و ابن مقلہ کے نزدیک بھی عربی زبان کا بہترین ماہر

۱۵۔ دونوں صفار کے رہنے والے تھے۔ عبید کا انتقال خلیفہ عبدالملک کے عہد میں ہوا اور وہب کا خلیفہ ہشام کے زمانہ میں

۱۶۔ اسکے تاریخی افسانے بہت مشہور ہیں حکومت بنو امیہ اور اس کا خاتمہ ساتھ ہی ساتھ ہوا۔

۱۷۔ یہ بھی خلیفہ ہشام کے عہد میں تھے۔

۱۸۔ امام مالک کی موطا بعد کو لکھی گئی ہے۔

۱۹۔ یہ کتاب الزہری کا مصنف تھا۔

تھا) عیسیٰ بن عمر و الشقفی (جس نے سب سے پہلے عربی قواعد کو مرتب کیا اور خلیل بن احمد اور سیبویہ کو درس دیا) امام ابو حنیفہ (جو ایرانی النسل تھے)، حماد بن شاپور (سبعہ معلقہ کا جامع)، بشار بن برد (ایرانی النسل اور عربی کا مشہور نابینا شاعر)، سیبویہ (مشہور نحوی)، علی بن حمزہ الکسائی، (یامون و امین کا آقا لیتق) ابو نواس (دربار ہارون کا مشہور شاعر)، الفرار (کسائی کا مشہور شاگرد)، ابن قتیبہ (مشہور مؤرخ) خفیش (سیبویہ کا مشہور شاگرد)، قسطلی بن لوقا (بلبکات کا عیسائی اور اپنے عہد کا بڑا زبردست ریاضی و ہیت دان) وغیرہ سب غیر اعراب تھے، جنہوں نے اپنی قابلیت اور فضل و کمال کے غیر فانی نقوش تاریخ میں ثبت کر کے، یہ حقیقت واضح کر دی کہ اسلام کی مساوات نے عرب و عجم، دونوں کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا تھا اور شریعت حقہ کے نزدیک یہی شخص مستحق عزت تھا جس نے اپنے اندر کوئی کمال پیدا کیا اور صرف فخر انساب کو ذریعہ امتیاز قرار نہیں دیا۔

قمر

اس مضمون کی ساری ترتیب صرف اس خیال پر منحصر ہے کہ بنو امیہ کی حکومت جو خالص عربوں کی حکومت تھی، ترقی علوم و فنون کے لئے زیادہ موزوں نہ تھی اور غیر اعراب کے ساتھ مساویانہ سلوک نہ کیا جاتا تھا۔ مغربی مکہ کا یہ تاریخ کی بنا پر یہ خیال آجکل زیادہ ترقی پذیر نظر آتا ہے، حالانکہ صاحب مضمون نے خود خلیفہ عبدالملک اور الزہری کے مکالمہ کا ذکر کر کے گویا خود ہی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ عہد بنی امیہ میں عہدہ قضا کے مالک تقریباً سب موالی تھے اور اس سے زیادہ روشن ثبوت، عربی حکومت کی رواداری اور خیال مساوات کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یقیناً عجم نے عہد بنی عباسیہ میں اکاسرہ ایران کی شان و شوکت کو دوبارہ زندہ کر کے دکھا دیا، لیکن کیا اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ یہی وہ ظاہری نمود و نمائش تھی جو آخر کار بغداد کی خلافت و حکومت کو کھا گئی اور یہی وہ کارنامہ اہل عجم کا ہے جس کا داغ اس کی عشرت پسندیشانی سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔

ادیر

ڈراما اور رومان

Drama and Romance

ڈراما اور رومان دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو واقعہ یا خیال صرف تفریح طبع اور عبرت کے لئے، قصہ کی صورت میں لکھی جائے، وہ رومان ہے اور جس سے مقصود یہ ہو کہ چند مخصوص افراد سے تمثیل کے طور پر ادا بھی کریں وہ ڈراما ہے۔

رومان اصل میں ایک قصہ ہے جو عوام کی زبان میں لکھا جاتا ہے۔ اس کا موضوع کبھی تاریخی ہوتا ہے (جیسے قصہ بنی ہلال اور سیرۃ عشرہ) کبھی محض وہمی اور خیالی، (جیسے کلیلا اور ومنہ کے اکثر قصے) اور کبھی رمزی اور انتقادی، جس سے محض تادیب اور تہذیب مقصود ہوتی ہے۔ چونکہ لوگ قدیم زمانہ سے اس قسم کی حکایتوں سے دلچسپی لیتے چلے آئے ہیں، اسلئے اگر یہ کہا جائے کہ قصہ گوئی انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔

ابتداء میں رومان، اشعار کی صورت میں لکھا جاتا تھا، جس کے ذریعہ سے لڑائیوں کے حالات، انقلابات حکومت وغیرہ کے واقعات، قصے کی صورت میں بیان کیے جاتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے نظم و نثر میں مختلف صورتیں اختیار کیں، جس میں سب سے آخری اور مہذب صورت تمثیلی حکایات یا ڈراما کی ہے۔

ڈراما اور رومان دونوں میں انسانی اخلاق اور عادات کی تمثیل اور شخصیت ہوتی ہے اور جن قہج کے دونوں پہلو دکھائے جاتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ڈراما کا دائرہ رومان سے تنگ ہوتا ہے، کیونکہ ڈراما کا موضوع ایک ہمیت مخصوصہ سے تعلق رکھتا ہے، اور اس میں چند خاص امور کا التزام بھی ضروری ہے۔ برخلاف اس کے رومان ان قیود سے آزاد ہے اور اس کا میدان زیادہ وسیع ہے۔ ڈراما خصوصیت موضوع کو دیکھتے ہوئے، رومان سے زیادہ مشکل ہے، کیونکہ تمثیل واقعات کیلئے تمام لوازم اور عوارض کا جمع کرنا ضروری ہے تاکہ واقعہ، حکایت کی حد سے ترقی کر کے، حدود مشاہدہ میں داخل ہو جائے، اور حوادث کا پورا منظر نگاہ کے سامنے کھینچ جائے۔

قصہ گو، یا رومان نگار، زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور اُسے تمثیل حوادث کیلئے تمام لوازم فراہم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن ساتھ ہی اسکے قصہ گو کو اس کی ضرورت ہے کہ بہترین اسلوب فصیح ترین تعبیر کے ساتھ، موثر پیرایہ میں اپنے مطلب کو ادا کرے، کیونکہ عبارت ہی ایک قصہ کو پُر لطف یا غیر دلچسپ بنادیتی ہے۔

یونانی رومان | ابتدائے عہد کے رومان، صرف حوادث تاریخی پر مبنی ہوتے تھے اور تخیل سے کام نہ لیا جاتا تھا چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ سکندر اعظم کے بعد یونانیوں نے جس قدر قصے اور رومان لکھے ہیں ان سب میں یونانیوں ہی کی فتوحات کا تذکرہ ہے۔ البتہ سلسلہ فتوحات میں غیر ملکیوں کی جو عجیب و غریب باتیں انہوں نے دیکھی ہیں، ان کا ذکر ضرور کر دیا ہے۔ یونانیوں میں اس قسم کا سب سے پہلا رومان وہ ہے جو "غرائب اور اے ٹولی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ رومان چند خیالی قصوں سے مرکب ہے، جن میں عشق و محبت کی داستان ہی شامل ہے۔ اسکے ایک زمانہ بعد ارسطیدس پیدا ہوا، اسکے متعدد قصے لکھے، جن میں بیباکی اور مذاق کا پہلو زیادہ غالب تھا۔ ان قصوں کا مقصد یہ تھا کہ انہیں پڑھ کر لوگوں میں خواہشات نفسانی پیدا ہوں۔ اس لئے ان میں ایسے عشقیہ مضامین، جن میں خلاف تہذیب عربانی سے کام لیا گیا ہے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اٹلی میں بھی، ارسطیدس کی تقلید میں بہت سے قصے لکھے گئے ہیں، لیکن زمانے نے ان سب کو ضائع کر دیا۔ یونانیوں کے ان قصوں میں علم الاصنام کی حکایات سے بہت کچھ مدد لی گئی ہے، جس کا زمانہ دراز تک یونان میں رواج رہا۔

ڈراما کی تفصیل | حکایت تمثیلی یا ڈراما کے ذریعہ سے انسان کے اخلاق و عادات کی تشخیصی مثال پیش کی جاتی ہے، اور ان مختلف حالات کی تصویر کشی کی جاتی ہے، جو معاشرت انسانی کے تعلقات سے رونما ہوتے ہیں۔ ڈراما کا بیان ایسا ہوتا ہے کہ گویا صاحب قصہ یا جو شخص قصہ سے اصولی تعلق رکھتا ہے، سامنے موجود ہے۔

ڈراما کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم میں متانت و سنجیدگی کی رعایت ہوتی ہے اور اس کے پڑھنے سے خوشی، رنج، مشقت کے جذبات میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ دوسری قسم میں مذاق اور ہزلیات کا پہلو غالب ہوتا ہے اور اسکے ذریعہ سے کم ہمت اور رذیل لوگوں کی اخلاقی حالت دکھائی جاتی ہے،

پہلی قسم کو تراجیدیا (Tragedy) یا روایات متینہ اور دوسری قسم کو کومدیا (Comedy) یا روایات ہزلیہ کہتے ہیں۔ موجودہ عہد میں اس ڈراما کو جسکا انجام غم پر ہو (Tragedy) اور جس کا نتیجہ مسرت انگیز ہو (Comedy) کہتے ہیں، لیکن پہلے ان دونوں کا مفہوم یہی تھا جو بیان کیا گیا۔

ٹریجڈی کی حقیقت | تراجیدیا، یونانی لفظ ہے جو اصل میں تراگوڈیا تھا یعنی وہ گانا جو بکرے کے سامنے گایا جائے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ یونانی اپنے معبود شراب (Bacchus) باخوس پر بکرے کی قربانی چڑھایا کرتے تھے، فصل انگور میں ہر سال باخوس کے گرد لوگ جمع ہوتے تھے اور خوشی و مسرت کے ترانے گاتے تھے۔ چونکہ یہ زمانہ شراب کی کثرت کا ہوتا تھا، اس لئے تمام لوگ شراب کے نشہ میں چور، گلی کوچوں میں گاسے اور طرح طرح کا مذاق کرتے پھرتے تھے، الغرض عشق، محبت اور تغزل اس موسم میں پورے شباب پر ہوتی تھی ایک مرتبہ ایک یونانی شاعر تھسبیس کو خیال ہوا کہ اگر اس موقع پر معبود باخوس کی مدح میں قصائد پڑھے جائیں کریں، یا تفریح طبع کے لئے ہومرو وغیرہ مشہور شعرا کے یونان کا کلام لوگوں کو سنایا جائے، تو زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ اس خیال نے عملی صورت اختیار کی اور عید باخوس میں ہر یونانی جماعت کے ساتھ ایک قصیدے خواں بھی رہنے لگا، جو مختلف اشعار کے ذریعہ سے جذبات میں جنش اور عواطف میں حرکت پیدا کرتا تھا۔ یونانی شوق سے یہ اشعار سنتے تھے اور سناتے والا گاتے وقت ایسی حرکات اور اشارات کرتا تھا جو مقصود کے سمجھنے میں مدد دیتے، اور قصہ کی صورت کشلی، نظروں کے سامنے پیش ہو جاتی۔

یونان میں ڈراما کی ترقی | اس کے بعد اسٹیکلس نے قصہ خواں کے ساتھ ایک اور آدمی شامل کر دیا۔ اب یہ دونوں شخص سوال و جواب کے طریقہ پر قصہ کہنے لگے۔ اور اس ضرورت کے لئے ایسے قصہ اور حکایتیں وضع کی گئیں، جو سوال جواب کے اسلوب پر ہوں، اور لطافت معانی و تحریک عواطف کا بھی ان میں پورا لحاظ رکھا گیا، جو کچھ عرصہ کے بعد یونان میں فنِ انشا کے بڑے ماہر اور مشہور شاعر سوفوکلئس اور اریسٹو نے پیدا ہوئے۔

سوفوکلئس کا کلام نہایت سنجیدہ، پر معنی اور موثر ہوتا تھا۔ وہ اپنے قصوں میں ترغیب و تہذیب

دونوں پہلو رکھتا تھا۔ اربید میں اس مرتبہ کا شاعر تو نہ تھا لیکن پھر بھی اس کا کلام نہایت لطیف ہوتا تھا اور وہ اپنے خاص اسلوب تعبیر سے حیات قلبی میں تحریک پیدا کر کے، جذباتِ محبت میں غیر معمولی ہیجان پیدا کر دیتا تھا۔ ان دونوں شاعروں کی بدولت فنِ تراجم یا تکمیل تک پہنچا اور یونان میں مخصوص مقامات معین کئے گئے، جہاں مختلف قصوں کی تمثیل اور شخصیت ہوتی تھی۔ ان مقامات کو تھیٹر (معب) کہتے تھے۔ لوگ اوقافِ محبت میں ہاں جمع ہوتے تھے، عورتیں اپنے بہترین کپڑے اور زیور پہن کر وہاں حاضر ہوتی تھیں اور اسلاف کے کارناموں کو تمثیلی صورت سے بیان کیا جاتا تھا۔

ڈراما اور سلطنتِ روما | جب یونانی حکومت کا خاتمہ ہوا اور رومن سلطنت قائم ہوئی، تو رومن لوگوں نے بھی اپنے شہروں میں تھیٹر قائم کئے، جہاں وہ بیکاری اور فراغت کے اوقات میں جمع ہوتے تھے۔ ابتدا میں انہوں نے صرف یونانی تراجمیات کی تقلید کی، لیکن ان کے قصوں میں تحریکِ عواطف اور ہیجانِ جذبات کا پہلو بہت کم تھا، اور شاعر سنیکا بھی جو حسنِ عبارت اور دقتِ اسلوب کے لحاظ سے مشہور ہے، اپنے کلام میں وہ خصوصیت پیدا نہیں کر سکا جو ڈراما نگاری کے لئے ضروری ہے۔ ہر چند رومن افسانہ نویس اور وقائع نگار تحریکِ جذبات کی کوشش کرتے تھے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے، کیونکہ ان کی روایات تمثیل میں تکلف و تصنع کا رنگ صاف نظر آتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ رومن قوم میں جذباتِ شریفہ مفقود تھے، اور ان کا میلان صرف شہوتِ پرست، خونریزی اور فاحشانہ خواہشات تک محدود تھا۔ ان میں وہ لطیف اور نازک خیالات نہ تھے جو یونانی طبائع میں پائے جاتے تھے، بلکہ وہ قتل و غارت کے واقعات سے زیادہ لطف اٹھاتے تھے، چنانچہ ان کے نقطہ نظر سے نیروں بہت بڑا شخص (ڈراما نگار) تھا، جو اپنے قصوں میں بربریت اور وحشت کے شرمناک واقعات کو نہایت خوبی سے ادا کرتا تھا۔

ڈراما اور دیگر ممالک | سوفیکلس اور اربیدس کے ایک زمانہ بعد دنیا میں تمدن قومیں پیدا ہوئیں اور انہوں نے تراجمیات کے اصلی ذوق اور مقصد کو پہچانا، ان میں بڑے بڑے شعراء اور اربابِ قلم پیدا ہوئے، جنہوں نے عواطفِ انسانی اور جذباتِ بشری کے مطابق حکایات اور قصے لکھے۔ قرونِ آخرہ میں فرانس کے اندر کورنیل، راسین، ولیر، کرنلیوں، انگلستان میں شکسپیر اسپین میں لوبورڈی ویکا اور کلدردن، اٹلی میں ٹرستین، ٹورے، اور مانی، جرمنی میں سیجلر اور غوتٹ

وغیرہ متعدد وقائع نگار گذرے، جن میں سے ہر ایک کا اسلوبِ بلاغت اور طرزِ تعبیر دوسرے سے علیحدہ ہے۔

ڈراما متاخرین کے نزدیک | متاخرین نے تراجم کا موضوع صرف یہ قرار دیا کہ اسکے ذریعے سے حیاتِ شفقت و عجب کی نثر ایک پیدا ہو، اور وہ اگر اس موضوع سے متجاوز ہوگا تو تراجم کے قسم سے خارج ہو جائیگا۔ تراجم کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس میں صرف پانچ فصلیں ہوں۔ اگرچہ چار سے بھی مقصود حاصل ہو سکتا ہے، لیکن پانچ زیادہ مناسب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ڈراما نگار، پانچ سے زیادہ فصلیں نہیں لکھتا، ڈراما کی ہر فصل میں چند حصے ہوتے ہیں جنہیں مشاہد (Scenes) کہتے ہیں ان حصوں میں مخصوص افراد کا مکالمہ ہوتا ہے، اور یہ صورت اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ واقعات کی ترتیب اچھی طرح ذہنِ مخاطب میں آجائے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اول سے آخر تک ایک ہی واقعہ بیان کیا جائے، تاکہ اجنبی واقعہ کے اختلاط سے حسنِ ترتیب فوت نہ ہو۔ ہاں اگر ایک ہی واقعہ کی متعدد فروع ہوں تو مضائقہ نہیں، نیز واقعہ کی وحدتِ زمانی و مکانی کی رعایت بھی ضروری ہے تاکہ سلسلہٴ حوادث، غیر منقطع طریقہ پر ذہنِ سامع میں مرتسم ہوتا جائے۔

بعض متاخرین نے ضرورت کے وقت اس قسم کے قیود سے آزاد ہونا بھی جائز قرار دیا ہے لیکن یہ آزادی سارے ڈراما میں نہیں ہوتی بلکہ ایک حلقہٴ فرعی میں ہوتی ہے۔

اصول فصاحت و بلاغت اور سلاستِ عبارت کا لحاظ بھی ڈراما میں نہایت ضروری ہے۔ ڈراما نگاری کے لوازم | ڈراما کے موضوع میں متانت اور سنجیدگی لازمی ہے اور موضوع کے موثر بنانے کے لئے مشاہد کا طبعی ترتیب کے مطابق ہونا اور شخصیں کا فنِ نقل اور تقلید میں پوری طرح ماہر ہونا از بس ضروری ہے۔ ڈراما کو سب سے زیادہ دلچسپ بنانے والی چیز یہ ہے کہ واقعات اس طرح بیان کئے جائیں کہ ہر واقعہ سننے اور دیکھنے کے بعد آئندہ واقعہ کی طرف شدید اشتیاق پیدا ہو اور اس کی صورت صرف یہ ہے کہ ترتیبِ حوادث اور فاصلہٴ واقعات اس طرح قائم کیا جائے کہ ہر واقعہ آئندہ کے ساتھ شدید ارتباط اور تعلق رکھتا ہو اور عجب و شفقت کا سلسلہ بھی ہر واقعہ میں پایا جائے، یہاں تک کہ آخری فصل میں موت یا قتل پر قصہ ختم کر دیا جائے

تاکہ اس کا اثر طبائع میں باقی رہے، کیونکہ طبیعت میں وہی بات دیر تک باقی رہتی رہے جو زیادہ موثر ہو اور آخر میں بیان کیجائے، نقل واقعات کے وقت شخصین کو آداب مجلس اور احترام حاضرین کی رعایت بھی لازمی ہے۔

کیڈی | کوڈیا وہ تمثیل ہے جس میں مضحکہ خیز واقعات اور ایسے حوادث بیان کئے جائیں، جو پست اور رذیل لوگوں سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن کوڈیا کے مصنف کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی تالیف میں ایک مفید غایت اور عبرت خیز نتیجہ کا لحاظ رکھے، تاکہ اسکے سننے سے عقول میں اصلاح اور اخلاق میں تہذیب پیدا ہو۔ جن افراد کی شخصیت اور تقلید کوڈیا میں کی جاتی ہے، ان کے اخلاق و عادات کی پوری تصویر و کامل تقلید ہونی چاہیے۔ چونکہ کوڈیا کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اخلاق اور عادات کی تمثیل پیش کی جائے، اس لئے ہر قوم اور ہر زمانہ کا کوڈیا دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ انگریزوں کی نظر انٹورمادیہ کی طرف زیادہ رہتی ہے، ذاتیات اور شخصی صفات پر ہر ایک انگریز تہناز کرتا ہے۔ اٹلی والے اپنے اجداد کی جاہ اور غیر متحرک طبائع کی تقلید کرتے ہیں اور فرانس کی نظر چونکہ اغراض ذاتی کی طرف نہیں ہے، اسی وجہ سے ان کے ڈرامے سب سے زیادہ لطیف، موثر، عبرت خیز اور عامۃ بشری کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور کوڈیا نگار شاعر مولیارتھا۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر اس کا نظیر نہیں تھا۔

کیڈی کی تاریخ | چونکہ عادات و اطوار کا اختلاف ہر زمانہ میں قائم رہا ہے، اس لئے اگر کوڈیا کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے گی تو معلوم ہوگا کہ ہر قوم اور ہر زمانہ کا کوڈیا دوسرے سے مختلف ہے۔

کوڈیا کی ایک قسم اوپیرا، یا اوپرا کومیک ہے اور یہ اصل میں ایک لطیف قصہ ہوتا ہے جسکی بنا دست بخش اور طرب انگیز واقعات پر ہوتی ہے، جس کے ساتھ رقص و سرود اور نفحات موسیقی بھی شامل ہوتے ہیں اور قصہ کی لطافت بڑھانے کے لئے جا بجا اشعار بھی آتے رہتے ہیں۔ روایات شخصیتی کے ابتدائی دور سے کومیک اس کے ساتھ ساتھ ہے، چند رہویں صدی عیسوی سے اٹلی والوں نے ہی اسکی نقل شروع کی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ خوشگوار موسم میں شراب پی پیکر کومیک

کا سلف اٹھاتے ہیں اور منظومات کو میاکت میں اپنے اسلاف کے زرین کارنامے اور ان کی قابل تقلید اعمال کی نقل کر کے طبائع میں تشویق اور تحریص پیدا کرتے ہیں۔

فرانس میں بھی اوپیرا یا کو میاکت ایتالیہ سے داخل ہوا ہے، سترہویں صدی میں ایک قانونی اوپیرا، فرانس میں قائم کیا گیا، جس میں شاعر کو ریل کی منظومات خاص دل چسپی سے پڑھی جاتی تھیں۔ اسکے بعد مولیاری اور گینیول کا زمانہ آیا، انگلستان میں ملٹن نے اٹالوی طرز پر اس فن کو رواج دیا، لیکن انگلستان، سوڈن اور اسپین میں سترہویں صدی کے بعد اس فن کی تکمیل ہوئی اور تمام ممالک کے مقابلہ میں اٹلی، جرمن اور فرانس کی موسیقی زیادہ مکمل ثابت ہوئی۔ بعد میں شعراء نے کوڈیا میں اسقدر تصنع کیا کہ اسے کوڈیا، تراجم یا اور تمام امور مطربہ کا مجموعہ بنا لیا۔

کوڈیا کی ایک قسم فارسی (Farsi) بھی ہے۔ یہ ایک ادنیٰ قسم کا کوڈیا ہے، جس سے مقصود صرف لوگوں کو ہنسانا ہوتا ہے۔ چونکہ اسمیں ہزلیات اور مضحکات زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے عوام میں زیادہ مقبول ہے، اٹلی، اسپین اور فرانس کے ڈراموں میں اسکا رواج کثرت سے ہے اور شکسپیر نے بھی اسمیں حصہ لیا ہے، مولیاری نے بھی اس قسم کے چند قصے لکھے ہیں، لیکن اسنے طبعی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

ناول اور ڈراما مفید چیز ہے اور تہذیب اخلاق، تحسین عادات، اور تحریک حیات میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔

کیڈی اور یونان | کوڈیا کی شہرت یونان میں بمقابلہ تراجم یا کے بہت ہوئی، کیونکہ یونانی طبائع میں وقار و سنجیدگی کا پہلو غالب تھا، اور وہ ہزلیات کو پسند نہ کرتے تھے، بعد کو اس میں اسقدر احتیاط کی گئی کہ قانونی طریقہ پر کوڈیا تصنیف کرنے کی ممانعت کر دی گئی، لیکن بعد میں رفتہ رفتہ اس نے بھی ترقی کی اور اس کے ذریعہ سے ارباب حکومت، اُمراء اور دوسرے طبقات کے اخلاق و عادات کی تمثیل ہونے لگی، اس میں سب سے زیادہ حصہ ارسٹوفانس نے لیا بعد کو جب حکومت نے دیکھا کہ کوڈیا کے ذریعہ سے اخلاق کی اصلاح ہوتی ہے تو اسنے ارسٹوفانس کی ہمت افزائی کی۔

عورتیں کوڈیا میں شریک نہیں ہوتی تھیں کیونکہ شریف طبیعت افراد اس سے نفرت کرتے

تھے اور یونانیوں کا عتو نفس اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ عورتوں کا ذکر ایسی مجالس میں آئے لیکن موجود زمانہ کی یورپین تہذیب نے عورتوں کو بالذات ملاعب میں داخل کر دیا اور بغیر ان کے کوئی تھیٹر مکمل نہیں ہو سکتا۔

ایٹیج کی تعمیر | ابتداء میں اہل یونان کے ملاعب یا تھیٹر کی عمارت لکڑی کی ہوتی تھی۔ اسکے لئے سب سے پہلے پختہ مکان یونان میں نمسکلیس نے بنایا۔ اس کے بعد اور بہت سے ملاعب تعمیر کئے گئے۔

یونانی ملاعب میدان میں بہت کم ہوتے تھے، بلکہ اکثر پہاڑ کے دامن میں بنائے جاتے تھے تاکہ دیکھنے والوں کو آسانی ہو۔ ملاعب کا منظر شمال کی طرف رکھتے تھے تاکہ دیکھنے والوں کے سامنے سورج کی شعاعیں نہ پڑیں۔ عمارت کے دو حصے ہوتے تھے ایک حصہ میں دیکھنے والے بیٹھتے تھے اور ایک میں شخصیں، حرکات تمثیلی کرتے تھے۔ تماشائیوں کی نشستگاہ نصف دائرہ کی صورت میں ہوتی تھی اور اس میں سیر پھیاں بنی رہتی تھیں تاکہ آگے والا شخص پیچھے والے کی نظر میں حائل نہ ہو، جو سیر پھیاں سب سے بلند ہوتی تھیں وہاں عام لوگ، پھر ان کے نیچے درجہ بدرجہ خواص کی نشست ہوتی تھی۔ جنہیں حکام، قضاة اور امارا سب شامل تھے۔

رومن ملاعب میں یہ ترتیب نہ تھی بلکہ مرد عورتیں، امیر و غریب سب ملے جملے بیٹھتے تھے اور جسے جہاں موقع ملتا تھا بیٹھ جاتا تھا۔ قیصر انکس کے زمانہ میں رومانی ملاعب میں بھی نشستگاہیں مخصوص اور بالترتیب کر دی گئی تھیں۔ یونانی اور رومن تماشگاہوں میں عورتوں اور غلاموں کیلئے مخصوص جگہیں ہوتی تھیں جو محل شخص سے دور ہوتی تھیں۔ محل شخص کے قریب ہی گانے والوں کی نشست ہوتی تھی، جہاں کسی دوسرے کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ محل شخص کی آرایش کیلئے خوبصورت تصویریں اور حوادث تاریخی کے نقشے ہوتے تھے، اور اس کے پیچھے وہ جگہ ہوتی تھی، جہاں شخصیں، ضرورت کے وقت اوضاع و لباس بدلتے تھے۔

رومیوں اور یونانیوں کے نزدیک معابد کے بعد ملاعب ہی کا مرتبہ ہوتا تھا۔ یونان میں متعدد ملاعب کے آثار پائے گئے ہیں۔ اسپارٹا کا ملاعب سب سے زیادہ خوبصورت اور سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔

ملعب یا جینی کے آثار میں زہرا (سیلو) کا مجسمہ نکلا ہے، جو اس وقت پیرس کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے ایشیائے کوچک اور افریقہ میں بھی متعدد تھیسٹروں کے آثار نکلے ہیں۔

روما میں بھی ملا عتب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ روما کا سب سے پہلا ملعب، بنائے ۳۹۰ سال بعد تعمیر ہوا تھا۔ روما میں ملا عتب کی عمارت لکڑی کی ہوتی تھی، جہاں لوگ کھڑے کھڑے تماشہ دیکھتے تھے روما کا سب سے پہلا تھیسٹر بنائے ۹۵ برس بعد بنا تھا، یہ عمارت اس قدر وسیع تھی کہ اس میں ۴۰ ہزار آدمی آسکتے تھے۔ اسکے قریب ایک دالان بنایا گیا تھا جس میں ایک سو ستون تھے جہاں پانی برستے وقت لوگ آکر ٹھہر جاتے تھے۔ اسکے علاوہ اور بہت سے ملا عتب کے آثار زیر زمین پنہاں ہیں، جنہیں سے بہت معام کر لئے گئے ہیں اور بہت سے ابھی زیر خاک پوشیدہ ہیں۔ فرانسیسی، اٹلی، اور اسپین میں بھی متعدد آثار تھیسٹروں کے موجود ہیں۔

جب یورپ میں غلبہ مسیحیت ہوا، تو تھیسٹروں کی رسم جاتی رہی، کیونکہ مسیحی، قدیم بت پرستوں کی رسوم سے سخت نفرت کرتے تھے۔ بعد کو جب مسیحیت کم ہو کر، علیم و فنون کی اشاعت ہوئی، تو سب سے پہلے اٹلی میں قدیم طرز کا ایک تھیسٹر بنایا گیا، جس میں ۵ ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے، (اب یہ عمارت منہدم ہو چکی ہے) پھر رفتہ رفتہ یورپ کے تمام شہروں میں متعدد تھیسٹر قائم ہوئے اور اصلاحات ہوتے ہوتے ان کی موجودہ صورت ہو گئی۔ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت تھیسٹر پیرس کے ہیں اور بدترین ہندوستان کے۔

نیا ن

غزل

توئی واعظا و ہوشے و کنار امن کو شے
من لغزشے وسیلِ خم چشم میفر و شے
نگہ ستم پرستم، چہ شو و خمبہ ندام
زنگاہ کیف پرور اگر م دہی تو نو شے
چہ زید کسے بہ عہد نگہ کر شمع سازت
کہ چکد ہزار بابل زنگاہ سحر کو شے
چو شد ست حق پسندے بہیں مقال واعظ
نہ دہی مرا خدا یا، سر گوش حق نیو شے

نہ نیاز ہم رہو دے دل پر سکوں چو دیدے
سحر بیاض گردن، قمر بہ ہندہ دو شے

نیا ن

لالہ رخ

”ایران کا نقاب پوش پتیر“

(پہلے اشاعت، سابق)

”اے عظیم، اے تصویرِ شبابِ مردانگی! تو نے دشمنوں کے مقابلہ میں، اپنی شہامت کا ثبوت دیا ہے اور ان کے شدید حملوں کی مدافعت کی ہے۔ تو نے دنیا کے نعب ترین حالات میں دشمنوں سے اپنی شجاعت کا اعتراف کرایا ہے، مگر طیارہ ہو جا کہ آج تیرا شدید ترین امتحان ہونے والا ہے۔ آج تو، حریمِ متنع میں داخل ہو گا، جہاں ہر حصہ زمین کا حسن، اپنی عشق انگیز نگاہوں سے تجھ پر تیروں کی بارش کرے گا، جہاں مہلک ترین نشتر تجھ پر آزمائے جائیں گے، اور جہاں عشق کے دیوتا کے پاس، ہر رنگ و ادا کا حربہ، ہنر پرست کرنے کے لئے مہیا ہو گا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ وقت پر کون سا خنجر، کونسا تیرا سکے ہاتھ آجائے۔ گھنٹی اور دروازہ پلکوں کے اندر چمک جائیو الے پارہ ہائے برق، جھکے ہوئے پوٹوں میں نگاہوں کے عریاں خنجر، آج تیری ہمت و جرات کا امتحان کرنے والے ہیں۔ پھر یاد رکھ کہ وہ نوجوان، جو اک حسنِ دلربا، ایک شبابِ سحر خیز کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے، لیکن آلودگی سے پاک رہتا ہے، اس کے سحر سے متاثر ہوتا ہے مگر ترغیباتِ ناپسندیدہ سے آلودہ نہیں ہوتا، وہی صحیح معنی میں فاتح ہے!

اس وقت حریمِ متنع میں آرائش و زیبائش کا اہتمام ہو رہا ہے، خادمہ لڑکیاں ادھر سے ادھر پھر رہی ہیں۔ ایک کو اگر طرہ سر کی زیبائش میں کمال حاصل ہے، تو دوسری فنِ نقاب انگنی میں ماہر، کس طرح اس میں اندازِ تغافل پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ایک اگر فنِ حنا بندی میں بے مثل ہے، کہ انگلیوں کی پوریں کس ترکیب سے ایسی خوش رنگ رنگی جاسکتی ہیں کہ اگر ان کا عکس آئینہ پر پڑ جائے تو تیرا آبِ شاخِ مرہاں کا کماں ہونے لگے، تو دوسری تحریرِ سرمہ میں کمال رکھتی ہے اور جانتی ہے کہ کن آنکھوں کو کس وقت شوخ نگاہی کی ضرورت ہے، کب انہیں چشمِ بیمار ہونا چاہیے اور وہ

خوبی جس کے لئے دوشیزہ سرکشیا، شاہان ذی اقتدار کو بتیاب بنادینے میں شہرت تامہ رکھتی ہے،
آنکھوں میں، کیونکر پیدا کی جاسکتی ہے۔

الغرض، اس وقت وہاں ہر شے متحرک اور ہر جز جنبش میں ہے، طرہ زر، گوہر آب دار اور جواہر
تابناک ہر طرف جگمگا رہے ہیں۔ چند کنیزیں باغ کے تختہ لبے گل میں سے، چاندنی سے دھوئے
تازہ پھول، چن کر لائی ہیں کہ سنورنے والیوں کے جوڑوں میں لگائیں۔ مسرور و سرشار دوشیزہ ہند چھپا
کی کلیوں کو دیکھ کر کس قدر متحیر نظر آتی ہے، جو اسے اس وقت کی یاد دلاتے ہیں، جب اس کے ساتھ
کھیلنے والیاں، کنار گنگ پر انہیں چپا کر پھولوں سے اس کے بالوں کو سجایا کرتی تھیں، اور ناظرہ
عرب کیسی مست مسرت ہے جسے مڑ کے شگوفوں کی نکست نے پھر اکیلا سرزمین عرب میں
پہونچا دیا ہے۔

ان وسیع و منور ایوانوں میں، جہاں فواروں کا سمیں تقاطر ایک عجیب و غریب ترنم پیدا کر رہا ہے،
گہومتا ہوا، عظیم ایک بڑے قصر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ حیران ہے کہ اس دنیا کے نور میں، آثارِ
زندگی کیوں نہیں بہ فرش کی نظر فریبی، تقریبی مجھروں میں عود و صندل کا سلگنا، اگر کی بتیوں کا چاروں
طرف فضا میں تعجب آمیز اثر پیدا کرتا، یہ سب کچھ ہے مگر کوئی صورت انسانی نظر نہیں آتی۔ اس ایوان
میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں روشنی و تابانی کے ایک سمندر میں غوطہ زن ہوتی ہیں۔ وسط
ایوان میں ایک خوبصورت فوارہ پانی کو اچھال رہا ہے، جو سقفِ مذکور کے زیرِ سمجھوں کو چھو چھو کر
مرمرین فرش پر گر رہا ہے۔ اس کے چڑھتے ہوئے پانی میں رنگین روشنیاں اس طرح منعکس ہوتی ہیں
گویا قوس قزح کو پارہ پارہ کر کے اس میں ملا دیا گیا ہے۔ ایک طرف ظروفِ بلورین کے اندر شفاف و
پاکیزہ پانی میں چوٹی چوٹی رنگین مچھلیاں چمک رہی ہیں، گویا پرستانی معدن سے نکلے ہوئے سونے
کے ٹکڑے ہیں، جو پانی میں ڈال دئے گئے ہیں۔ دوسری جانب صندلین پنجروں میں انواع و اقسام کے
خوبصورت پرند آویزاں ہیں۔ مست و سرور کناری، عرب کے نیلگوں کبوتر، ہندوستانی شاما، جوشوالوں
کے کنگروں پر بیٹھ کر اپنے پاکیزہ نغموں کی بارش کرتی رہتی ہے، وہ مرغانِ طلا رنگ جو فصل کی طیاری
کے زمانہ میں باغوں میں آجاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے انہوں نے کوئی ایسی خوشبودار، مغیر شے کھالی ہو،
جس کی مستی نے ان کو اس طنیانی بہار کا والد و شید ا بنا دیا ہے، اور وہ چڑیاں جو عربستانی آفتاب کے اندر

شکوہ بارالائی کے درخت میں گھونسل بنانی ہیں۔ الغرض تمام نادرو حسین پرندے جو فضا کے پاکیزہ میں
بال کشا ہو سکتے ہیں، یہاں منسروف ترنم ہیں اور حقیقی معنی میں فردوس کا منظر پیش کر رہے ہیں۔
اس منظر تخیل فرسا کے اندر جو بجائے قیام گاہ پیغمبر ہونے کے بہشت شداد نظر آتا ہے، عظیم
اپنے دل میں خیال کرتا ہے۔

کیا یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے، انسان کی روح دنیا کی مصیبتوں سے آزاد
ہوگی؟ کیا یہی وہ تعلیم ہے کہ اس زندگی میں پاک لوگوں کے لئے کوئی راحت
نہیں، سوائے اس راحت کے جو نیک اعمالی سے اس کی روح کو حاصل ہوا اور
مرنے کے بعد اس کا نام روشن ہو کر دوسروں کے لئے نشانِ ہدایت اور شہرت کی
بلندیوں پر روشن و منور ہو؟

اے شریفانہ جذبات اور شجاعانہ افکار کے پیکر حسین! جو کچھ تجھ سے کہا گیا ہے، یہاں اُسے
تلاش نہ کر! یہاں تو اس عیش مکروہ کے بہانہ سے تیری آزادی کے قوائے مقدس کو مفلوج کئے
جانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ جس چیز نے فدا یانِ حریت و صداقت سے وہ غیر فانی کا بنائے کر لئے،
جن سے آج دنیا روشن ہے، وہ اس نشاطِ انحطاط آفریں کا اثر نہ تھا، بلکہ وہ جفاکشی، پرہیزگاری
اور نیک خصلتی کا نتیجہ تھا۔ اس لئے وہ یقیناً ایک پیغمبر صادق نہیں ہو سکتا جو اپنے مقصدِ حیدر
مقدس کو دنیا کے فانی جاہ و حشم سے آلودہ کر دے!

میں جانتا ہوں کہ مقنع مجھے ایک کمزور و ناتواں انسان تصور کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ
عیش و طرب کی یہ نمائشیں مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیں گی۔ ہاں اے مقنع کی روشنیوں،
چمکو اور اپنی پوری طاقتوں کے ساتھ چمکو! میری فطرت کو تم خیرہ نہیں کر سکتیں اور وہ
تمہارا مقابلہ کرے گی۔

یہ خیالات مجھے جو عظیم کے دل و دماغ کے سامنے آنے والے ہیں سبلی کی طرح چپک گئے؛ لیکن
با اینہم اسکی ہر سحر ہوئی جا رہی ہے، تعطر و بخور کا تنفس ایک بیسٹاروح کی طرح فضا پر حاوی
ہے، فواروں کے خاموش نغمے شہد کی مکھیوں کے ان خواب اور گیتوں کا اثر رکھتے ہیں، جو کھست بار
پھولوں کے گرد ہجوم کر کے اسکے غنچوں کے عمق میں گاتی گاتی سو جاتی ہیں۔ موسیقی اور دور کی موسیقی

(یعنی اک دریائے ترنم) کسی مخفی مقام سے اک موج نغمہ پیدا کر رہی ہے۔ الغرض یہ سب کچھ اسکی طاقت برداشت سے بہت زیادہ ہے اور اس لعطریں اس قدر نشاط و سکون پہنا رہے کہ وہ دل، جو اس طلسم روح پرور سے سحرزہ ہو جائے، شاید دنیا کی کسی شے کا احساس نہیں کر سکتا ہے۔

عظیم اپنے نرم و نازک حیات کے ساتھ ایک صندلی تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے حواس کو اس خیریں ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جس طرح طوفان کے بعد سطح بحر پر موجیں نزاکت و سکون کے ساتھ ایک دوسرے پر آ کر ٹوٹتی ہیں، اسی طرح عظیم کے بحرِ تخیل پر زلیخا کے یاد کی موجیں آ کر ٹوٹنے لگیں۔ وہ اس زمانہ کی یاد کرتا ہے، جب یہ دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں میں ڈوب ڈوب جاتے تھے، اور سکوتِ مسرور میں اس حد تک محو رہتے تھے کہ گویا اس عالم میں خدا نے اور کوئی شے پیدا ہی نہیں کی، یا تمام کائنات ان ہی کی نگاہوں میں سما گئی ہے۔

زلیخا، میری پیاری زلیخا! تیری یاد اسوقت بھی میری ہمدم ہے۔ تیری روح مجھ میں اب بھی ساری ہے۔ میں جہاں کہیں بھی ہوں تیرا ہوں، اور صرف تیرے لئے ہوں۔ میں اگر ناموری چاہتا ہوں تو صرف اسلئے کہ وہ تیرے رونقِ عذار کی وجہ ہو سکے، اگر کامیابی کا مرانی چاہتا ہوں تو محض اسلئے کہ وہ تیری تابشِ حسن کا باعث ہو سکے۔ میں تیری محبت افشاں نظروں میں اپنی جانفشانیوں کی داد پڑھ لینے کی تمنا رکھتا ہوں۔ میں اگر تیرے ایک تبسمِ زیر لب سے شاد کام ہو جاؤں تو اس لمحہ مختصر کو حیاتِ جاوید سے بیش قیمت سمجھوں گا۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ جب میں تجھے پھر پاؤں گا اور تیرا پسلیو (جہاں میں اسوقت بھی حکمراں ہوں) میری گرمیِ قلب کا باعث ہو سکے گا تو میں اس مسرت کا تحمل کیونکر کروں گا؟ ہر چند میں اس لطف و محبت کے قابل نہیں، کیونکہ اس حالت و کیفیت کا مستحق تو ایک بہترین انسان کو ہونا چاہیے۔ آہ، یاد آیا! وہ ساعت جب میں نے تیرے نازک ہونٹوں کا خصوصی بوسہ لیا تھا! میں پھر ایک لذیذ بوسے سے اُن آنسوؤں کو خشک کروں گا، جنہیں صرف تیری ہی روح جاری کر سکتی ہے اور اُن آنسوؤں میں وہی حرارتِ محسوس کروں گا جو آنکھ سے نکلتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اُف جب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو میرا دل ٹرپ کر رہ جاتا ہے۔

عظیم، اپنے اس فردوس خیال کے سیر میں مجھ ہے اور ۲۷ ٹری دی ریلوے، اس نغمہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، جسکا ہر سر، فاصلہ کی اثر آفرینی سے سلسلہ سحر کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ آوازوں کی سمت مڑتا ہے، اور بیشمار قمقموں کی طویل قطار میں جس طرح ایک شفاف چشمہ پر انعکاس شفق ہوتا ہے (ایک دریا کے نور و بجلی رواں دیکھتا ہے۔ حد نظر پر پریوں کی ایک قطار اسے نظر آتی ہے اور وہ اس کی جانب بڑھتا ہے۔ اس انبوہ لطافت میں بعض پریاں، جنہیں پھولوں کی زنجیر سے باہم وابستہ کر دیا گیا ہے، سچ و خم کے ساتھ رقص میں مصروف ہیں، اور بعض آزاد و غیر پابند ہو کر حلقہ رقص کے گرد چکر لگا رہی ہیں، گویا پروانوں نے شمع کے گرد ہجوم کر رکھا ہے۔ چنگ و رباب کی موسیقی اور ان کے نغمہ ہائے مسکریں گم ہو جانے والے عظیم کی آنکھوں کے سامنے، پریوں کا قریب تر آنا اور پھر دور ہٹ ہٹ جانا، وہ منظر ہے، جس کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ اس منظر لطیف میں غرق ہے کہ دفعۃً پریوں نے اپنی موسیقی بند کر دی اور ان کا ہجوم اس طرح منتشر ہو گیا، جس طرح خورشید کے گرد گلابی بادلوں کے ٹکڑے شام کے وقت پھیل جاتے ہیں، البتہ اس ہجوم میں ایک رعشہ ناک دوشیزہ پیچھے رہ گئی۔ ہر خیمہ وہ اپنے ساتھ کی پریوں سے لوٹ آنے کی درخواست کرتی ہے، مگر کوئی اسکی تعمیل نہیں کرتا، اور اس خاورستان میں وہ تنہا رہ جاتی ہے۔ گویا اسکے چہرہ پر کوئی نقاب نہیں ہے مگر شیراز کی لڑکیوں کی وضع پر ایک نہایت سبک و مرصع جھومر اس کے کیسوؤں اور کافوری پیشانی کے ایک حصہ کو چھپائے ہوئے ہے۔ زینچا اس حالت میں کشش محترزانہ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اسکے ایک ہاتھ میں صندلی رباب ہے، جسپر لمبھی دانت اور سونے کا کام ہے، اور خود وہ ایک سخی مضطرب ہو کر تاروں کو چھوتی اور پھر اپنی مرتش انگلیوں کو ہٹا لیتی ہے۔ ایک اچھتی ہوئی نظر، اک خط کہربائی، عظیم کے چہرہ پر ڈالتی ہے اور ایک مطالعہ گریز یا سے کچھ مطمئن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ غزال نیم وحشی کے مانند اک جھجک کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور کاشانی مسند پر بیٹھ کر رباب کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور یوں نغمہ زبیر ہوئی ہے۔

گلاب کے اس کنج میں جہاں تمام تمام دن اور تمام تمام رات بلبل نغمہ سرائی کرتی رہتی تھی، ایام طفلی میں پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں میں چھپ کر بلبل کے گیت سننا، اب ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ آہ اس کنج کی نغمہ آفرینیاں مجھے کبھی فراموش نہیں ہو سکتیں۔

جب موسم اپنے شباب پر ہوتا ہے، تو میں اکثر سوچا کرتی ہوں کہ آیا وہ بلبل، اس کنج میں

اب بھی مصروفِ ترنم ہے یا نہیں؟ آیا اس وقت بھی رود بند میر کے کنارے اسی طرح
تابناک و ساکن ہیں؟ مگر پھر سوچتی ہوں کہ امواجِ دریا پردہ جھکی ہوئی شاخسائے گل کیونکر
ثرمدہ ہونے سے بچی ہوں گی، جن کے نوزائیدہ غنچے ہم چن لیا کرتے تھے اور ان کے قطراتِ
قندیم، پنکھڑیوں سے پھوڑ کر زمین پر ڈال دیا کرتے تھے؟

ماضی کی یاد سے، انکے فنا ہو جانے سے قبل، میں مسرت حاصل کر نیکی کوشش کرتی ہوں۔ وہ ماضی
جس نے میری روح کو منور کیا تھا، اور جس کی یاد شاید ہمیشہ میرے خیال کی نگاہوں کو منور
بنائے رکھے گی۔ کیا وہ کبج اب بھی رود بند میر کے کنارے آباد ہے؟

غریب لڑکی، اگر میرے پاس تو اسلئے بھیجی گئی ہے کہ اپنے حسن کی تابناکیوں اور اپنی
موسیقی کی لطافتِ باریوں سے میرے دل کو غیر مقدس خواہشات سے لبریز کر دے،
تو تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ حقیقتاً تو اس فن سے بے بہرہ ہے۔ اور یوں ہی، ہر چند تیرے
پنکھڑی سے لبِ مجبور ہیں کہ وہ اپنی جنبش کو ایک غلط راستہ کی دعوت پر صرف کریں،
مگر تیری عصمتِ بار آ نکھیں اس نغمہ فریبِ کار کی ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں، وہ اس وقت
ہی اس کی تردید کر رہی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تیرا نغمہ، عہدِ شباب کے پاکیزہ ترین
جذبات کا حامل ہے، اور مجھے اس فضا کے معصوم میں کہنیچے لئے جاتا ہے، جہاں خیال
معصیت کے لئے انسانی دماغ تنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلئے میں اپنا فرض تصور کرتا
ہوں، کہ اس سے قبل کہ تیری آرزوئیں جاوہِ پاکیزگی سے منحرف ہوں، اے قمری
لطافت! میں تیرے قفس کی تیلیاں توڑ دوں اور تو پھر چمنِ محبت کی فضا میں
سرایا پرواز بن جائے،

عظیم، منور اس خیال کی انتہا پر نہ پہنچا نکھا کہ ایک جانب لا جو ردی پردہ، حرکت میں آتا ہو
اور نہایت آہستگی کے ساتھ کھل کر بے شمار آنکھیں، شام کے نیلیں آسمان میں طلوعِ انجم کی طرح، خنداں
نظر آتی ہیں۔

پردہ جب پورا اٹھ جاتا ہے اور کنواریاں (پرستان کے معلق نسترِ زار میں رہنے والیوں کی طرح)،
خوش و منتبہ، نمودار ہو جاتی ہیں، تو نسیم کے فرحت بخش جھونکوں کے ساتھ یا سیمیں پہلوؤں کی بارش

شروع ہوتی ہے اور ایک لطیف و رفیقِ رقص، جسکا تعلق فرش سے نہیں بلکہ فضا سے معلوم ہوتا ہے، شروع ہو جاتا ہے۔

زلیخا، اس ہنگامہ رقص و موسیقی کو دیکھ کر اپنا بدن چراتی ہوئی اس طرح اٹھ جاتی ہے جس طرح صبح بہاراں کی شعاع آفتاب سے متاثر ہو کر بنفشہ کے پھول سمٹنے لگتے ہیں۔ عظیم دور ہی سے ایک آہِ سرد کے ساتھ اسکی مشالیت کرتا ہے لیکن قریب جا کر اسکو دیکھنا گوارا نہیں کرتا کہ مبادا اس کی نگاہیں اس کے حسن کو میلانہ کر دیں۔

رقص کر نیوالی کنواریاں رقص کر رہی ہیں، انکی گردنیں گویا مینائے مرمرین ہیں، جن کے اندر شراب ارغوانی بھری ہوئی ہے اور انہر مشرقی جواہر کی زیبائش، یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلوؤں کے ہر کسی آبگینہ رنگین پر ڈال دیئے گئے ہیں۔ ان کے رقص کا ہر دائرہ قوس قزح نظر آتا ہے اور انکی طلائی پازیموں کے گونگر اپنی آواز روح میں پیوست کئے دیتے ہیں۔

رقص، آخر کار ختم ہو جاتا ہے، ایک لڑکی دوسری کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے اور انکا سر پہ مگر خفی تنفس، پردوں سے گذر کر پھولوں کی نکھت میں مل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک پرسکون چشمے کی طرح، موسیقی سیال جاذبِ سامعہ ہونے لگتی ہے، اور عظیم، اس منظر تبسم و موسیقی، اس نظارہ رنگ و گل سے، مضحک ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس ہنگامہ میں، محسوسات کو تھوڑی سی آزادی دیدینا ہی، تباہی ہے، اسلئے وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور دیواروں کی آرائش و زیبائش سے دل بہلانے لگتا ہے۔ نقاشی و مصوری کے ان مناظر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو اسکے لئے بالکل نئے اور سخت حیرت انگیز تھے۔ وہ ایک تصویر دیکھتا ہے جس میں مصور نے اپنے موئے قلم کی تمام جاں بخش نزاکتوں کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ دامنِ نقاب، جلوہ بے محابا سے زیادہ دلکش اور نیم نگاہی نظارگی عریاں سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ اسکے بعد اسے دوسری تصویر دکھائی پڑتی ہے۔ جس میں عزیر مصر کی بیوی زلیخا، جوشش شوق میں اپنی آغوش کھول دیتی ہے اور عبرانی نوجوان اسکے شبابِ فتنہ زاسے بھاگتا اور مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا ہے کہ کہیں وہ اس بلائے حسن سے قریب تر تو نہیں ہو گیا۔

مسرور نگاہوں کے ساتھ عظیم، ان تصویر ہی افسانوں کو پڑھتا ہوا ایک کھڑکی کے قریب پہنچ جاتا ہے، جہاں سے سکون ماہتاب میں وہ چمن کا نظارہ کرتا ہے لیکن مسحوری خیال کے زیر اثر، وہ ایسا

محسوس کرتا ہے کہ شاید نسیم کے جوتے منجمد ہو گئے ہیں اور نہر کی روانی بے جان۔ صدائے موسیقی اب بعید ہو جاتی ہے اور اس قدر نرم ہو کر اس تک پہنچتی ہے، گویا فضا نے اس غناؤں موسیقی کے اندر سے وہ سب کچھ جذب کر لیا ہے جس کا تعلق تاثراتِ ارضی سے ہے، اور اب وہ مطلقاً سماوی بن گئی ہے۔ ان کیفیاتِ آفریں مناظر اور اس تاثرِ عالم میں وہ اپنے ہجومِ جذبات سے بیتاب ہو کر اپنی حیاتِ معاشقہ کے خوابوں میں مستغرق ہو جاتا ہے۔

بے خبر ہستی! خواب دیکھے جا، اور اس خوابِ پوشیدہ سے کہی بیدار نہ ہو! کیونکہ تیری روح کیلئے یہ سب آخری فرصتِ لطف و مسرت ہے۔ اس وقت سے پہلے کہ تیری مسراتِ رویا تجھ سے چین لے جائیں، اپنے پیکرِ جذبات کو آغوشِ خیال میں لیکر، جس قدر لطف حاصل کر سکتا ہے، کر لے! اس تبسمِ خمی حیات کا خواب دیکھ لے، جس نے وقتِ وداعِ تیرے دل کو اپنی روشنی سے بہر دیا تھا، اُن آنسوؤں کی یاد کر لے جو جدائی کے وقت تیرے سامنے پیش کئے گئے تھے، اور جن کی پاکیزگی کو بہترین گوہرِ شاموار ہی نہیں پہنچ سکتے۔ ہاں، اس تبسم و اشکِ فشانِ ہستی اور اس مکان و فضا کا تصور کر لے، جہاں وہ اس وقت بھی تنہائی و بکیسی کے ہجوم میں تیری منتظر ہے اور ایک تنہا جگر گانے والے ستارہ کی طرح تیرے لئے سراپا انتظار بنی ہوئی ہے۔ آہ یہ تیرا خواب جس کی شیرینی و لطافت تیرے دل کی تنہا روشنی تھی، آج تباہ ہو نیا لا ہے اور ہمیشہ کے لئے معدوم!

موسیقی خاموش ہو جاتی ہے اور آوازِ نغمہ موقوف۔ دوشیزگانِ بزمِ آرا خصلت ہو جاتی ہیں اور عظیم ایک آہ جگر خراش سُنتا ہے، ایک گریہ طال اُسے اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ مگر یہ کون ہو سکتا ہے؟ عظیم کے دردمند دل کیلئے صدمہ و حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہ جاتی، کہ اس عشرتِ آباد میں غم و محن، رنج و مصیبت کیونکر بارپا سکتے ہیں؟ وہ ہچکیوں اور سسکیوں کی جانب بڑھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ایک گوشہ میں ایک نقاب پوشِ نازنین، دیوار کے سہارے کھڑی ہے۔ اس تصویرِ غم کا لباس نیلگوں ہے۔ جیسے بخارا کی عورتیں کسی عزیز کی مفارقت یا موت کے وقت پہنتی ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ تمام کیفیاتِ پیش نظر ہو گئیں، جن سے وقتِ وداع، زلیخا کا دل بھرا ہوا تھا اور جب اسکی آواز بند ہو کر صرف گرم گرم آنسوِ جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

اسکے جذبات میں ایک تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک عالمِ بخودی میں اپنی آغوشِ کھول دیتا

ہے وہ زار و زار لڑکی ہی عشق کی پذیرائی کیلئے بڑھتی ہے، مگر قبل اسکے کہ وہ عظیم کی آغوش تک پہنچے اس پر غش طاری ہو جاتا ہے، اور بیہوش ہو کر گر پڑتی ہے۔ نقاب سرک جاتا ہے اور عظیم جمالِ زلیخا کا نظارہ کرتا ہے۔ زلیخا کی حالت اس قدر بدلی ہوئی تھی، کہ سوائے عظیم کے کوئی دوسرا اسکو پہچان بھی نہ سکتا تھا۔ وہ چند لمحے کے لئے شک شبہ کی تصویر بن جاتا ہے، پہر اسکا سر اپنے زانو پر رکھ کر پیشانی سے حلقہ ہائے گیسو مٹاتا ہے۔ اسکی بند آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ اپنی زلیخا کو دیکھتا ہے، اس زلیخا کو جسکی یاد میں اس نے اتنا زمانہ بسر کر دیا ہے، اور جس کے مسرت و ملال دونوں حالتوں میں اس کے لئے ایک جاذبیت، ایک کشش ہوا کرتی تھی۔

عظیم :- زلیخا میری پیاری زلیخا، اپنی آنکھیں کھول، ایک مختصر لمحہ کیلئے اپنی روح کے اُن غروں میں مجھے وہ نشانِ لطیف دیکھ لینے دے، جس سے میری بیتاب محبت کو تسکین ہو کر تھی۔ عظیم پر اپنی نگاہِ لطف پرور کی جنتوں کے دروازے کھول دے۔ کیسا مبارک تھا وہ ذریعہ و سبب جو تیرے یہاں پہنچنے کا حیلہ ہوا! اگر دنیا کی تمام نعمتیں فراہم کر دیجائیں اور مجھے اختیارِ انتخاب ملے، تو اے میری پیاری! میری نگاہِ انتخاب صرف تجھ ہی پر پڑ سکتی ہے، اور اسوقت میں ہی باور کر رہا ہوں کہ تمام عالم کی نعمتیں مجھے دیدی گئیں ہیں۔ کیونکہ آج میں بھر اپنی زلیخا، تمثالِ لطافت اور پیکرِ عصمت زلیخا کو اپنے پہلوئے شوق میں دیکھ رہا ہوں۔

عظیم کا ایک بوسہ جو اثراتِ کربائی سے لبریز تھا، زلیخا کی آنکھوں کو مس کرتا ہے اور زلیخا کی آنکھیں اس طرح کھل جاتی ہیں، جیسے برف، ہوا کے اثر سے آہستہ آہستہ پگھل کر اپنے نیچے دبے ہوئے نیلگوں رنگ کے پہلوؤں کو نمایاں کر دیتی ہے۔ اسکی نظر میں عظیم کی آنکھوں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہیں، لیکن اُن میں بے چینی و وحشت ہے۔ وہ بیتاب و مضطرب ہے، اور اسکا سارا جسم عظیم کی آغوش میں ایک مستقل لرزش بنا ہوا ہے۔ آخر کار وہ اپنے تمیں، اُس کی گود سے نکال لیتی ہے اور ایک درمند چیخ کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ اس طرح چپا لیتی ہے، گویا اسکی زندگی کی تمام لغزشیں چہرہ پر منقوش ہیں، جنہیں وہ کسی کو دکھانا نہیں چاہتی۔

زلیخا کی چالست اور اسکی چیخ کے ساتھ اس جگہ کے تمام مناظر و حالات دفعتاً عظیم کے ذہنِ دماغ

پرستولی ہو جاتے ہیں، اور مرگ ناگہانی کی طرح اس کے لبرز شوق دل کو سرور دیتے ہیں۔ اب ہر چیز اس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہے اور وہ محسوس کرتا ہے کہ صحیح معنی میں اس کی زندگی کی تباہی آج ہی سے شروع ہوتی ہے۔

زلیخا:۔ آہ عظیم! ہر چند میں اپنے تئیں برباد کر چکی ہوں، مگر یہ یقین نہ کرو کہ کذب و مصیبت اپنی طرف راغب کر سکتے ہیں نہیں بلکہ میرے مفتوح ہونیکا سبب میرا ناقابل برداشت اندوہ و الم تھا، جس نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ تمہارے دل میں میری محبت کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہ رہنی چاہیئے، لیکن میرے کہنے کا اسقدر ضرور یقین کرو کہ مجھ میں ایک ذرہ عقل و حواس باقی رہنے تک بھی، دنیا میں کوئی شے مجھے تم سے منحرف نہیں کر سکتی۔ مجھ سے تو کہا گیا تھا کہ تم مارے گئے! کاش ہم دونوں کے جدا ہوتے وقت مجھے برق صاعقہ بارنے جلا کر خاکستر کر دیا ہوتا! کاش تم جان سکتے، تمہیں یقین آسکتا کہ میں نے ایام مفارقت کس طرح سیل اشک بہا بہا کر بسر کئے ہیں! گویا درازی ہجراں ایک درخت تھی، جسکی آبیاری میں نے اپنے آنسوؤں کی تھی۔ اس طویل جدائی کا ایک ایک لمحہ میں نے صرف ایک تمہارے خیال میں بسر کیا ہے، اور صرف تمہارے خیال کی بار بار میں نے اسقدر تکرار کی کہ وہ بھی آخر کار درد و کرب بن گیا ہو اور مفارقت سے سرور ہو جائے والا دل اس پارہ برق کی مثال تھا۔ جو قطرہ قطرہ ہو کر بہ جاتا ہے۔ کاش تم دیکھ سکتے کہ میں دروازہ پر کھڑی رہ رہ کر تمہارے انتظار میں کتنی صبحوں کو شام تک پہنچایا ہے، راتوں کی طویل گھڑیاں بیم ورجا کی جاں گسل کشمکش میں کس طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دی ہیں، کیونکہ میرے کانوں میں تو تمہاری آواز قدیم ہر وقت گونجا کرتی تھی! خدایا، تو واقف حال ہے کہ جب لشکر غم میرے دل کی آبادی اور میری امیدوں کو بے رحمی کے ساتھ زیر و زبر کر رہا تھا، جب ”عظیم مارا گیا“ کی دھواں آواز نے میرے حواس کو معطل کر دیا تھا، اس وقت دنیا و آسمان کی تمام روشنیوں میں ایک جہلک بھی میری نظر کے لئے نہ رہ گئی تھی اور ساری دنیا کی مصیبت میری جاں گداز تکلیف کا نصف ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ عظیم، تم مجھے رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہو، ہاں میں جانتی تھی کہ میرے حال زار کا فسانہ المناک

تمہارے دل کو ضرور نرم کر دے گا۔ اور تمہارا رنج و غصہ افسوس و ترحم سے بدل جائیگا۔
وہ مکار و دغا باز، جو مجھے دھوکا دیکر یہاں لے آیا، اس نے مجھ سے ایسے قصے بیان کئے کہ اگر
میری جگہ فرشتہ ہوتا تو وہ بھی اس کے دام فریب میں آجاتا۔ اور اس کے مکر عظیم سے
بچنا محال ہوتا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ میں ابدی نور کی فضا میں تم سے مل سکوں گی، ہمیشہ تم میرے
آنکھوں کے سامنے رہو گے اور میں تمہارے کوڑھنگاہ سے جبرئیل مسرت ہوتی رہوں گی؛ لیکن
اس پر سکون زندگی کی مستحق وہی مقبول و برگزیدہ ہستیاں ہو سکیں گی، جو اس عالم میں متنع
کی خدمت کر سکیں۔ سوچو، غور کرو، کہ میرے لئے یہ کس قدر دیوانگی فزا امید تھی۔ تم میری
حالت پر روتے ہو، آنسو بہاتے ہو! ہاں بہاؤ اور ضرور بہاؤ! کاش میں ان آنسوؤں کو
اپنے بوسوں سے خشک کر سکتی۔ مگر نہیں، میرے ناپاک لب تمہاری مقدس سانس
کو نہیں چھو سکتے۔ میرے لئے وہ ایک لمحہ خود فراموشی، جو کبھی تمہاری آغوش محبت
میں حاصل ہوا تھا، کافی ہے میں اسکی قدر کروں گی اور آخری سانس تک میری روح
اسی کی پرستش میں مشغول رہے گی۔ یہ یاد میرے دور خوش کامی کا آخری تبرک ہوگا، اُس
وسیع سمندر کا ایک قطرہ شیریں ہوگا، جو اب بالکل خشک ہو چکا ہے۔ مگر اب تمہیں
یہاں سے جلد چلا جانا چاہیئے اور ہمیشہ کیلئے رخصت۔ یہ مقام تمہارے مقدس قدموں کے
قابل نہیں ہے۔ میں نے اپنی تباہیوں کا ابھی نصف بیان ہی نہیں سنا یا ہے، اتنا
سمجھ لو کہ یہاں معصیت کی حکومت ہے اور ہماری روجوں کے درمیان بد نصیبی کا ایک
ایسا طوفان حائل ہے جسکی تاریکی مجھے تمہاری ہستی سے اسی طرح علیحدہ کر رہی ہے جس
طرح حبت سے دوزخ!

عظیم:۔ زلیخا! زلیخا! عرش پاک کی قسم اگر باب اجابت ہنوز مسدود نہیں ہو گیا ہے، تو یقیناً
تیری نغز نشیں نظر انداز کیجائیں گی اور تیری خطائیں بخش دی جائیں گی، تیرے محسوسات
کی معصومی اور تیرا انفعال قلبی، تیری نجات کے ضامن ہیں۔ محبت کی اس مقدس
روشنی کی قسم، جو ہم دونوں کی روجوں کے مزار پر اب بھی عکس فگن ہے، اور جو تیرے
دل میں یہاں کی آنسو دگیوں کی کثرت سے اور دل میں مایوسیوں کے طوفان سے بھی

فسردہ نہیں ہو سکی ہے، ہر خند کہ اس فضا کے مکروہ و کثیف نے تجھ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے، لیکن تو نجات حاصل کر گئی۔ اس لئے تم میرے ساتھ چلو اور اس ناپاک زمین کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دو۔

زلینجا:۔ میں تمہارے ساتھ چلوں! تم مجھے ہمراہ لے چلو گے! خداوند! کیا میں اتنی خوش قسمت ہو سکتی ہوں؟ آہ، یہ مسرت تو ایک طویل عمر کی اذیت و صعوبت کے مداوہ سے بہت زیادہ ہے۔ پیارے عظیم، سچ کہو، کیا تم مجھے، ایک تباہ کار مہتی کو اپنے ہمراہ لے چلو گے؟ اپنے دلنواز پہلو میں جگہ دو گے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ لمحات تاثر و کیفیت، جن میں ہم دونوں اس قدر خوش اور آسودہ رہ چکے ہیں، پھر واپس مل جائیں گے؟ آہ، اگر یہ خواب ہے تو ایسا خواب ہے، جس میں جنتوں کی طمانیت پنہاں ہے، اور ایسی نوشدارو ہے جو مدتوں کے مردہ دلوں کو حیات تازہ بخش سکتی ہو۔ تمہارا قرب محبت پرور، اب مجھے ہمیشہ حاصل رہیگا، ان ہونٹوں کے ملکوتی نغمے ہر وقت میرے لئے نوازش سامعہ ہوتے رہیں گے، یہ محبت پاش نگاہیں ہر لحظہ میری روح کو اپنی شرابوں سے سرشار کرتی رہیں گی، اور حسب طرح داعدار چادر، سورج کی روشنی میں سفید بھی معلوم ہوتی ہے، اس بطرح تم اپنی پاکیزگیوں کو میرے اوپر منعکس کرتے رہو گے! غروب آفتاب کے وقت جبکہ خاٹلی و مجرم ضمیر پر گناہ کی یاد اپنی پوری طاقتوں کے ساتھ یورش کرے گی، تو تم اپنی لبریز اشک، پیاری پیاری آنکھیں آسمانوں کی جانب اٹھاؤ گے اور اپنی زلینجا کے حق میں دعائیں مانگو گے اور میں بھی اپنی ضعیف و خطاکار نگاہوں کو اسی نقطہ پر جادیا کرونگی؛ یہاں تک کہ رحمت خداوندی کیلئے، ایک پیکر غم کا دل گرفتگی کے ساتھ ہر وقت تمہارے پہلو سے لگے رہنے کا نظارہ ناقابل برداشت ہو جائیگا، اور فرشتہ رحمت پیام عفو اور مردہ نجات لائیکہ!

ہنوز زلینجا کی گفتگو ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کسی طرف سے آواز آئی، "اپنی قسم کو یاد کر! اپنی قسم کو یاد کر!!" زلینجا کی رگوں میں جو خون، ابھی ابھی متحرک ہو گیا تھا اس آواز سے زرد رنگ میں تبدیل ہو گیا اور نہایت ضعیف و مردہ آواز میں اس نے عظیم سے کہا۔

"یہ اسی کی آواز ہے، یہ وہی ہے اور میں اسی کی ہوں۔ بس اب سب کچھ ختم ہو گیا۔ تم یہاں سے

اپنی جان بچا کر نکل جاؤ، ورنہ تم ہی تباہ و برباد کر دیئے جاؤ گے۔ آہ، خدایا، میری قسم، ہاں یہ سچ ہے کہ میں مقنع کی منکوحہ ہوں اور ہمیشہ کے لئے اسکی ہو چکی ہوں جسوقت میں نے یہ منحوس قسم کھائی تھی، مرد و لکی روحیں وہاں شہادت کیلئے آئی تھیں۔ اور میری قسم کو ان کے نیلے ہونٹوں نے دہرایا تھا۔ میں اسوقت بھی وہی خوفناک آوازیں سن رہی ہوں، انکی انکھیں میرے سامنے چمک رہی ہیں۔ جب میں نے پیمانہ عہد کو منہ سے لگایا تھا، تو میں نے محسوس کیا تھا کہ کوئلے ہوئے خون کا ایک گھونٹ میرے حلق سے اتر رہا ہے۔ اسکا اثر اس وقت بھی میری زبان پر ہے۔ آج رات کو میں نے اپنے نقاب پوش شوہر کی شکل بھی دیکھی۔ خدا ہی خوب جانتا ہے کہ اسنے اسکی شکل سے زیادہ کریہ اور خوف آفریں صورت کوئی اور بھی بنائی ہے یا نہیں۔ اب میں یہاں سے جاتی ہوں۔ کیونکہ میں نہ تو تمہاری ہو سکتی ہوں اور نہ خدا کی، نہ محبت کی ہوں اور نہ کسی ایسی چیز کی جو مقدس ہے۔ آہ تم مجھے اپنی آغوش میں مضبوطی کے ساتھ لئے لیتے ہو، مگر شاید نہیں جانتے کہ جو شیطان، دلوں میں تفریق پیدا کر سکتا ہے وہ ہاتھوں کو بھی جدا کر سکتا ہے۔ اچھا پیار سے عظیم، خدا حافظ! ہمیشہ کیلئے خدا حافظ!!

دیوانگی و جنون کی حالت میں کمزور بھی شہ زور ہو جاتے ہیں اور یہی دیوانگی کی طاقت تھی کہ زلیخا، عظیم کی گود سے نکلا کر ایک چمچ کے ساتھ اس مقام سے بسرعت چلی جاتی ہے، اور نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

شاہزادی لالہ رخ، زلیخا و عظیم کے عشق و کام کی داستان اور الم نصیبی کے بیان سے اسقدر متاثر ہوئی کہ تمام دن، اسکا خیال اسی میں مصروف رہا۔ مسرت اندوزی کا جذبہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے پاس سے یکسر معدوم ہو گیا ہے اور وہ اسقدر انہماک میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسنے فضل الدین کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔ اسنے ایک قسم کی بچپن مسرت کے ساتھ اول مرتبہ یہ تصور کیا کہ عظیم بالکل فرامرز کی طرح ہو گیا۔ کاروان شاہی جسوقت ایک دور افتادہ ندی کے کنارے سے گزر رہا تھا، شاہزادی نے ایک ہندو ویشیزہ کو دیکھا۔ اسکا نا وقت اس تھا مقام پر ہونا شاہزادی کی حیرت کا باعث ہوا۔ قافلہ رگوا گیا اور اس نے دیکھنا چاہا کہ یہ لڑکی کیا کرتی ہے۔ ہندو لڑکی نے ایک چھوٹا سا گھی کا چراغ روشن

کیا اور اُسے ایک تھالی میں رکھ کر ہولوں کے بار سے آراستہ کیا۔ اس کے بعد کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اسکو دریا کے لہروں کے سپرد کر گئے، سخت بیم ورجا کی تصویر بنی ہوئی اسکی روانی کو دیکھتی رہی شاہی قافلہ کی شوکت و حشمت ہی اس لڑکی کی توجہ اپنے طرف مائل نہ کر سکی، جس سے لالہ رخ بھی متحیر اور متعجب ہوئی۔ خدام بارگاہ میں سے ایک شخص نے جو دریا بے گنگ کے کسی ساحلی مقام کا باشندہ تھا، شاہزادی کے سامنے آکر بیان کیا کہ ہندو عورتوں میں یہ ایک رسم تباہی ہے جو کسی عزیز کی مراجعتِ وطن یا اس کی خیر و عافیت کے متعلق اپنے شکوک و اوہام رفع کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے۔ دریائے گنگ کے کناروں پر جہاں ہندو عورتیں اور لڑکیاں اس طرح شگون لیتی ہیں، یہ نظارہ اکثر اور کثرت کے ساتھ دیکھنے میں آتا ہے۔ اگر چراغ گل ہو جائے یا ڈوب جائے تو اسکو شگون بد سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر وہ چراغ روشن رہ کر ہوتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جائے، تو پردیسی پریمی کی صحت و واپسی یقینی سمجھی جاتی ہے۔

قافلہ روانہ ہو گیا، مگر لالہ رخ، بار بار مڑ کر ہندو دوشیزہ کی شمع تباہی کو دیکھتی رہی اور حسبِ آخری مرتبہ ہی اُسے چراغ کو روشن دیکھا تو اس خوش فالی سے نہایت خوش ہوئی، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس چراغ کی حفاظت پر ایک شباب آغاز دوشیزہ کی زندگی کا انحصار ہے اور محسوس کر رہی تھی کہ اس لڑکی کی امیدیں ہی اتنی ہی کمزور تھیں، جس قدر اس چراغ کا شعلہ منزل کا باقی حصہ نہایت خاموشی کے عالم میں طے ہو گیا۔ اور قافلہ منزل پر پہنچ گیا، لیکن اس وقت تک کہ شاہزادی کے بارگاہِ جمال میں فرامرز کے تار ہائے رباب کی صدا پیدا نہ ہوئی، وہ اسی خیال میں منہمک رہی اور اسکے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں مسرت کی چمک پیدا ہو گئی۔ آخر کار فرامرز طلب کیا گیا، جس نے داستان کا باقی حصہ یوں شروع کیا:۔

(۶)

خلیفہ ہمدی، ہر چند یونانیوں کے ساتھ معرکہ آرا ہونے کے بعد ایک گونہ خستہ ہو رہا تھا، اور نہیں چاہتا تھا کہ اسکی فوجیں فوراً ہی کسی جنگ میں مشغول ہو جائیں، لیکن ہر ساعت کی اطلاعات نے اسکے سامنے آنیوالے خطرات کو ایسی صورت میں پیش کیا کہ ابنِ مقنع کا استیصال اسکے نزدیک ضروری ہو گیا۔ چنانچہ خلیفہ نے، ان اطلاعات کے پہنچتے ہی عہد کیا کہ جب تک وہ اسلام کو اس خلعِ مدعی

نبوت کے فتنہ سے پاک نہ کر لینگا، آرام نہ لینگا۔ اور جس وقت تک وہ اس گروہ مرتدین کو پسپا و منتشر نہ کر لینگا، عیش و مسرت کے خیال کو اپنے دل میں جگہ نہ دیگا۔

احکام جاری ہو جاتے ہیں، ایک مرتبہ ہر خلافت عباسیہ کے پرچم ہوا میں لہرائے کیلئے کھول دئے جاتے ہیں، اور سپاہ اسلام، اپنی تمام شوکت و سطوت کے ساتھ متقن کی سرکوبی کیلئے روانہ ہو جاتی ہے۔ کل جن میدانوں میں زندگی کی علامت مفقود تھی، آثارِ حیات تھے، آج ایک شہرِ خیام نظر آ رہا ہے، اور عین وسط میں دربارِ خلافت کا قمری شامیانہ قائم ہے۔

اس اجتماع سے شور و غل اور قہقہوں کی صدائیں بلند ہو ہو کر ہوا میں ملتی ہیں اور در و در تک پہنچ رہی ہیں کبھی فوجوں کے گھوڑوں کے ہنہانے کی آوازیں ہیں تو کبھی ساربانوں کی صدائیں سننے میں آ جاتی ہیں، کبھی طبل جنگ کی موسیقی ضیافتِ سامعہ ہوتی ہے، تو کبھی حبشیوں کی بانسروں کے مدہم سر سامعہ نواز ہو رہے ہیں۔ غرض لشکرِ خلافت عجیب و غریب نظارہ پیش کر رہا ہے اور اسلحہ و سپاہ کی شان و عظمت کی یہ نمائش اپنے قسم کی نادر ترین نمائش ہے۔

اس طرف اگر لشکرِ اسلام، دنیا کی مختلف، شجاع ترین اقوام پر مشتمل ہے، تو دوسری جانب متقن کی فوج بھی اتنی ہی تعداد میں ولایتِ ایران کے مشہور و منتخب جنگجو قبائل سے طیار ہوئی ہے، اور پروانِ متقن کے علاوہ آتش پرستانِ فارس بھی اسکے شریک ہو گئے ہیں۔ صفیں آراستہ ہوتی ہیں اور حملہ کا آغاز ہو جاتا ہے۔ خلیفہ مہدی اگر اسلام کو ایک فتنہ مذہبی سے پاک کر دینے کے بعد کی خوشی کے خیال سے سرور اور دستِ بدعلی ہے، تو متقن بھی سمجھ رہا ہے کہ آج ہمیشہ کیلئے فیصلہ ہو جاتا ہے، یا تو تمام عالم اسکے زیرِ نگیں ہو جاتا ہے یا اسکا کارگاہِ مذہب و تبلیغ ہی ہمیشہ کیلئے ختم ہوتا ہے۔

ایک جانب خلیفہ اسلام اپنے لشکر کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے ”بڑھے چلو، حق و صداقت کے علمدارو! کیونکہ شہیدوں کیلئے جنت، اور فاتحین کیلئے غازی کا درجہ ہے“ دوسری سمت متقن پکار رہا ہے ”بڑھے چلو، انتقام کے حامی بہادرو، بڑھے چلو! نامردوں اور گمراہوں کیلئے شیطان کی غلامی اور بندگی ہے۔ لڑائی پوری قوت کیساتھ ہو رہی ہے۔ اور ایک سخت مقابلہ کے بعد سپاہِ خلافت کے پانوں اکھڑ جاتے ہیں۔ متقن، خود خلیفہ کے پرچمِ شبِ رنگ کو اٹھا لیتا ہے اور اس یقین سے کہ اب مشرقِ اعظم اسکی ملکیت ہے، فخر و مباہات سے معمور ہو جاتا ہے۔ ہنوز وہ اس مسرت کے خیال سے کافی بہرہ اندوز نہیں ہونے

پاتا ہے، کہ شورِ حرب میں ایک غیر معمولی تبدیلی نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یکا یک شکست خوردہ فوج اسلام کو کوئی روک دیتا ہے؛ وہ فوج پلٹ پڑتی ہے؛ اور ایک ناقابلِ مدافعت ہجوم کر کے حملہ آور ہوتی ہے۔ اس حملہ کا سپہ سالار اس وقت ایک نوجوان ہے، جو اپنی صورت کے لحاظ سے ایک فرشتہ آسمانی معلوم ہوتا ہے، اور فہامت کے آثار و علامات، جو اسکے بشرہ کا جزو مستقل نظر آتے ہیں، اسکی روئیں تن ہونیکا یقین دلاتے ہیں۔ اسکا حملہ اسقدر سخت ہوتا ہے کہ متقنع کی فاتح فوج سپاہیوں نے لگتی ہے، ہر قدم پر جو آگے اٹھتا ہے، اس سپہ سالار کے چہرہ میں امید و جرات کی رنگینیاں بڑھتی جاتی ہیں اور ہر لمحہ میں اسے اپنی فتح کا یقین ہو رہا ہے متقنع، میدانِ کارزار کے وسط میں کھڑا ہے اور ہر جذبہ کو شش مقابلہ کرتا ہے، مگر اسکی فوج، بادلوں کے ان ٹکڑوں کی طرح، جو دھندلے چاند کو تنہا چوڑ کر چلے جاتے ہیں، بہاگی جاری ہے۔ وہ پکارتا ہے مگر کوئی نہیں سنتا؛ وہ لعنتوں کی بارش کرتا ہے، ملامتوں کا دریا بہاتا ہے مگر کوئی کان نہیں دہرتا۔ اور آخر کار نہرِ حیرت خوردہ متقنع خود بھی جائے پناہ کی تلاش کرنے لگتا ہے۔

فوج اسلام میں معجزہ، کا شور مچ جاتا ہے۔ ہر تنفس کی نظریں نوجوان سپہ سالار پر جم جاتی ہیں، مگر وہ ہر کہ اسے اس دنیاے حیرت اور عالمِ استعجاب کی پروا ہی نہیں؛ اور متقنع کے تعاقب میں بدحواس ہے، بچپن و مضطرب ہے۔ سپا شدہ فوج، متقنع کے سپاہی، اسکی تلوار کی زد میں ہیں، مگر انپر اسکا ہاتھ نہیں اٹھتا اور اسکے غصہ و غضب کا آتش نشانِ مادہ صرف ایک متقنع کی ملعون ہستی کے لئے محفوظ ہے۔ لیکن باوجود سعی و جستجو وہ متقنع کو نہیں پاتا۔

باوجودیکہ متقنع کی فطرتِ درشت کے لئے فرار اختیار کرنا ماروا سا تھا، مگر وہ اپنی فوج کے ہجوم میں کچھ اس طرح گہرا ہوا ہے۔ کہ وہ اپنے تئیں، اس رحبتِ قہقری کے سیل میں قائم نہیں رہ سکتا۔ اور سب کے ساتھ بھاگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ تاہم وہ اپنے غم و غصہ میں بلا تحقیق دوست و دشمن سیف آزمائی میں مصروف ہے۔ آخر کار اللہ اکبر کی تکبیریں بلند ہوتی ہیں اور فتح مند خلیفہ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ عسکرِ خلافت نے فتح پائی اور متقنع مفرور ہو گیا۔ جشنِ نصرت میں تمام لوگ حصہ لیتے ہیں۔ اور بازار اور راستے زرین بنا دئے جاتے ہیں۔ معبدِ منور کئے گئے ہیں، اور ہر طرف چراغاں ہو رہا ہے۔ مگر اس تمام شادمانی و نصرت میں، اس تمام ہجوم و انبوه میں ایک جذبہ اور بھی ہے جو باقی تمام جذبات سے قوی اور شدید ہے، اور وہ جذبہ رشک ہے۔ عظیم تختِ خلافت کے روبرو پیش ہوتا ہے۔ خلیفہ اسلام آسمان و پذیرائی کی تصویر بنا ہوا اس کے

اداسے آداب پر متبسم ہوتا ہے۔ اسکا نام ہزاروں زبانوں کا وظیفہ ہو جاتا ہے، اور لوگ اسکا نام لے لیکر مسرت و شادمانی کے لغزے بلند کرتے ہیں۔ مگر خود عظیم پر کوئی اثر نہیں ہے، وہ اسی طرح بے پردا و بے تعلق نظر آتا ہے، جس طرح قبل از جنگ دنیا نے اسے دیکھا تھا۔ اور وہ اسی قدر مفہوم و مکر رہا یا جاتا ہے۔

بد نصیب عظیم، تیرا پنج و درنج ہے، جسے نصرت و فحتمندی کی مستری ہی زائل نہیں کر سکتیں۔ تیرا غم وہ غم ہے جسے ایسی صد ہا فتوحات ہی دفع نہیں کر سکتیں۔ تیرا الم حد امید سے گذر گیا ہے، منہا چارہ ساری اسکے بہت پیچھے رہ گیا ہے، اور تیرا علاج کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک تاریکی ہے، ایک بار دسکون ہے، جس کو کوئی قوت روشن نہیں کر سکتی۔ دنیا میں اور بھی ایسے دل گذرے ہیں جن پر غم و اندوہ نے تدریج کے ساتھ قبضہ کیا، مگر تیرے اوپر تو، اسے شباب فنا گشتہ، کوہِ غم کی شکست یکبارگی ہوئی، اور اس حالت میں جبکہ ہر جزیرہ تیری چشم شوق کے سامنے لطف و مسرت کا لباس پہنکر جلوہ آرا تھی، آرزوئیں اور امیدیں تیرے ساتھ مٹے مسکرا رہی تھیں، ماضی نے عیش حال کا قالب اختیار کر لیا تھا، ٹھیک اسی وقت غم کا کوہِ آتش فشاں بھٹ پڑا اور تیری آرزوؤں کو تو وہ خاکستر بنایا گیا، جذبات کے نشوونما کو پامال کر گیا، گویا وہ کسی فوارے کے قطرات تھے جو جبت و صعود سے قبل تو منجمد نظر آتے ہیں، لیکن اوپر پہنچ کر کچھ نہیں رہتے، مگر آوارگی و انتشار اور فرش پر گر جانے کے بعد صرف ایک سیل بیکار! عظیم کے قلب و جگر میں اب کچھ باقی نہیں، اس کے خون میں کوئی حرارت نہیں، مگر انتقام کی! اسکی نبض کی حرکت اب صرف اسی ایک خیال پر منحصر ہے، جسکے سہارے وہ زندہ ہے۔ وہ اس ذات سے، جس نے اسکی ہستی اور محبت کو تباہ کر دیا ہے، ایک سخت انتقام لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہی جذبہ تھا کہ جب اسے خلیفہ کے لشکر کشی کی خبر مائی، تو ایک شکاری باز کی طرح میدانِ حرب میں جھپٹ کر پہنچا، کہ متلغ سے بدلہ لے اور جو وقت لشکرِ اسلام کیلئے کوئی امید باقی نہ رہی تھی، تو عظیم نے اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا اور ایک عالم کو فنا ہونے سے بچا لیا۔ اور انتقام ہی کیلئے وہ اس وقت بھی، فخر و مباہات، عزت و عظمت کے خیال سے بے پروا نظر آتا ہے۔ اب اگر کوئی خیال اسکی تنفس کی آمد و شد کا تنہا سہارا ہے تو صرف یہ کہ کسی طرح وہ برقِ سوزندہ کی ایک ٹرپ بن جائے، انتقام لے اور اسرودہ ہو جائے۔

مقنع ایک مختصر گروہ کے ساتھ حیون کو عبور کر کے مروجا پہنچا ہے، اور اپنے گم کردہ تختِ عظمت پر آخری باز نگاہِ حسرت ڈال کر خشک میں مستحکم ہو جاتا ہے۔ اور اپنا علم ابیض بلند کر کے پرگندہ جماعت کو فراہم کرتا، اور متعاقب فاتحین کا انتظار کرتا ہے۔

مقنع اپنے غنچہ زارِ شعریہ و موسیقیت کی تمام شیرینی میں صرف ایک ہستی کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لایا تھا، اور وہ ہستی بد نصیب زلیخا کی تھی۔ اسکا یہ انتخاب حسن و جمال کی بنا پر نہ تھا، کیونکہ وہ تو اب اس کلی کی طرح تھی جو شام کی اُداسی میں شاخ سے گر کر زمرہ ہو جاتی ہے، اور نہ یہ نگاہِ انتخاب بر بنائے محبت تھی، کیونکہ مقنع کے خار زار دل میں اس پاک جذبہ کا پایا جانا محال تھا، بلکہ زلیخا اسکا شکار تھی اور یہی سبب اسے منتخب ہونیکا تھا۔

رات نے تمام عالم کو تاریک بنا دیا ہے، اور سامنے کے وسیع میدانوں میں چراغاں کا سماں منظر ہے، گویا برسات میں کوئی کنج باغ سامنے کر دیا گیا ہے، جہاں بیشمار جگنو جو سما میں منتشر ہیں۔ ان روٹیوں کے سامنے حلا آور کا کرپ روشن ہے، جس کی قناتوں اور خمیوں کا وسیع و طویل سلسلہ منہمکے افق تک چلا گیا ہے۔ مقنع اس شہرِ خیام کو دیکھتا ہے اور یہ خیال کر کے کہ ہر خیمہ میری قوت ایک حد تک پامال ہو چکی ہے، پہر ہی مجھے عمدہ براہوں نے کیلئے لاکھوں کا لشکر درکار ہے، مسکرا دیتا ہے۔

اس شیطان کی مدد سے، جسے شاہِ اسیر یا کی عظیم الشان فوج کو آنِ واحد میں تباہ کر دیا، میں اس لشکر کو بھی مٹا دوں گا اور آج رات کو دوزخ کے تمام اعماق اس فوج سے بھر دے جائیں گے۔ انجام کار تخت کا مالک پیغمبر ہو یا خلیفہ، بہر حال اس نوع انسان کو تباہ ہونا ہے اور میں اس نفرت انگیز دنیا کو مظلومیت کی چنج پکار سے آباد دیکھ سکوں گا!

مقنع، اس طرح اپنے خبث باطن کو تسلی دیکر، اس مختصر جماعت پر نظر ڈالتا ہے، جو اسکے گرد موجود ہے اور اس سے مخاطب ہوتا ہے :-

اُس آسمانی نور کے محافظو، جسکی روشنی نہ تو خون کے سمندرون سے اندر سُکتی ہے، اور نہ دنیا کی کوئی اور چیز اسے محاق میں لاسکتی ہے، یاد رکھو کہ اسکی تابش کے سامنے وہیم اکاسرہ اور جو اہر آبدار اسی طرح افسردہ ہو جاتے ہیں، جس طرح طلوعِ سحر کو وقتِ آسمان پر تارے۔ میرے بہادر و خوش ہو جاؤ کہ کامیابی ہمارے پیش نظر ہے، اور فتح و

ظفر ہماری کنیز۔ لوح مقدس پر، جسے فرشتوں کے سوا کوئی نہیں دیکھ سکتا یہ پیشین گوئی ثبت ہو چکی ہے کہ جس وقت نخب کے چاہ مقدس سے چاند طلوع کرے گا، اسلام کی حشمت کا شیرازہ منتشر ہو جائیگا۔ اور نظریں اٹھاؤ اور دیکھو!

پروان مقنع نے اس جگہ کے ساتھ ہی نگاہیں اٹھائیں اور ایک عجیب و غریب روشنی کا طوفان چھایا ہوا دیکھا۔ چاہ نخب سے ایک پورا چاند طلوع کر کے عروج پر پہنچتا ہے اور تمام آبادی و ویرانہ منور ہو جاتا ہے، تمام لوگ اس ساحرانہ نمائش سے مبہوت مرعوب ہو کر سیدے میں جھک جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چاند ان کی ہر میت پر رحم کیا کر آئندہ جنگ میں ان کی امداد کیلئے نیچے اتر آیا ہے۔ یہودیوں نے دیکھا اور یقین کر لیا کہ یہی وہ نور ہے جو موسیٰ کے لئے ظاہر ہوا تھا اور اب امت موسوی کی سلاسلِ غلامی کو توڑنے کے لئے روشن ہوا ہے۔

سارا گروہ ہم آہنگ ہو کر نعرہ فتح بلند کرتا ہے۔ مقنع جو موقع کا انتخاب کرنے میں کامل ہے، فوراً شہر کے دروازے کھلوا دیتا ہے، اور ہمدی کے لشکر پر حملہ آور ہوتا ہے۔ لشکر اسلام کا طلایہ گرد سوار، جو اپنے فرض منصبی کو فراموش کر کے اس مافوق الفطرت روشنی کے تماشے میں محو ہو گیا تھا، اپنے تئیں ایک آہنی بازو کی غیر متوقع گرفت میں پاتا ہے اور اس کی خوفناک چیخ کے ذریعہ سے خطرہ کی اطلاع لشکر اسلام کو ہو جاتی ہے۔

بڑھے چلو بہادرو، اس روشنی کی سمت بڑھو، جو سامنے سراپردہ شاہی کو نمایاں کر رہی ہے۔ اپنی تلواروں کو ادنیٰ درجہ کے خون سے بے آب نہ کرو، خلیفہ، تو اس قنات کے اندر مصروفِ راحت ہے۔ وہ نیزہ خوش نصیب ہے، جس کا صرف ایک دارا اسکی حیات کو قطع کر سکے۔

تلوار کے مقابلہ میں تلوازا اور نیزہ کے جواب میں نیزہ بلند ہونا شروع ہو جاتا ہے اور کمپ کی تیز روشنیوں میں سپاہ اسلام شہد کی مکھوں کی طرح آوازِ طبل کے ساتھ ہی اُمنڈ پڑتی ہے اور آخر کار ساری فوج اپنی پوری قوت کے ساتھ طیار ہو کر مقابلہ آرا ہو جاتی ہے۔ حملہ آور کو مجبور ہو کر پھر راہِ نخب اختیار کرنی پڑتی ہے مقنع کا نفرتی نقاب اس ہنگامہ میں کبھی کبھی اس طوفان زدہ کشتی کے بادبانوں کی طرح نظر آ جاتا ہے، جسے وقتاً فوقتاً طوفان ہی کی خفیف اور دھندلی روشنی بڑھ کر نمایاں کر دیتی ہے۔

لیکن کیا اس مغرور ہستی کا پندار، بالکل باہمال ہو گیا ہے، کیا اسکے ابرو کے مغرور خم کو سیدھا اور اسکی

ختم نہ ہونیوالی جراتوں کو ضعیف کر دیا گیا ہے، نہیں، ہر خند کہ وہ بد نصیب، جنکو شب گذشتہ اس —
فتح و کامرانی کا یقین کر دیا تھا نصف کے قریب تیر تیغ ہو چکے ہیں، لیکن اسوقت پھر وہ سب کو حکومت
عزت حاصل ہونیکا یقین دلارہا ہے اور وہ ہیں کہ اب بھی اسکی باتوں پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ ایک
عاشق اُن نگاہوں کی طرف سے جنہوں نے اسکا دل چرایا ہے بے اعتبار ہو سکتا ہے، ایک بچہ آسمانی
قوس قزح کے ساتھ کھیلنے کا خیال بھلا دے سکتا ہے، ایک کیمیا گراپنے بنائے ہوئے سونے پر شک کر سکتا
ہے، لیکن اعتقاد جب ایک دفعہ قائم ہو جاتا ہے تو متزلزل نہیں ہوتا اور اسکا استحکام اک طلسمی صورت
اختیار کر لیتا ہے۔

خراسانی خادع، تالیفِ قلوب کے اُن تمام طریقوں کا ماہر تھا، جو صرف عزازیل ہی کو معلوم ہیں، او
اسلئے وہ آخر وقت تک ہمت نہیں ہارا، اور اپنی تمام تدابیر کے دوران میں اُس نے زلیخا کو فراموش
نہیں ہونے دیا۔

بد نصیب زلیخا! اگر فہم و ادراک تیرے دماغ میں یکسر خوابیدہ نہ ہو جاتے، تو وہ خوفناک مناظر جو تیرے
سامنے گذر رہے ہیں اسقدر تھے کہ تو انکا نصف حصہ ہی برداشت کرنے کیلئے زندہ نہ رہ سکتی، اور
موت کا فرشتہ تیری روح کو مقام موعود پر پہنچا دیتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا، کیونکہ تیرے خیال پر ملک خود تیری زندگی پر
ایک قسم کا شک، ایک تعطل، ایک بے حسی راسِ خوفناک رات کے بعد سے، جبکہ تجھے ایک سخت
روحانی جدوجہد کرنی پڑی تھی، طاری ہے۔ اور اسوقت سے تیرے امن و راحت کی آخری امید بھی تیرے
پاس سے رخصت ہو گئی ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی رشتہ جنوں نمودار ہونے کیلئے ایک ناکام کوشش کرتا رہا ہے،
جیسے کہ آتش فشاں اپنے اندر سے رقیق مادہ کو وقتاً فوقتاً لہروں کے ذریعہ سے باہر نکال کر پھینک دینے کیلئے
آمادہ رہتا ہے، لیکن تو اسوقت بھی تعطل و بے حسی کی تصویر بنی رہی۔

مقنع کے حکم سے، زلیخا آج پہر اسی شانِ رعنائی سے سنہواری جاتی ہے اور اسکے سپاندہ مریدوں میں جو
عقیدت بڑھانے کیلئے لائی جانیوالی ہے، گویا وہ ایک ایسی دوشیزہ جمیل تھی جسے مصریانِ قدیم دلکش انداز
میں بنا سجا کر دریائے نیل پر قربانی چڑھایا کرتے تھے۔

زلیخا اپنی قربانگاہ پر جانے سے قبل سر نیچا کئے کھڑی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آذربستانِ یونان کا کوئی بت ہے
جس میں خون کی جگہ رنج و الم کا گہرا رنگ بہر دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ مفتح کی فتنہ ساز یوں کا خزانہ ایک دن خالی ہو جائیگا، طالع ماہ کا معجزہ اسکے کیدِ عظیم کا آخری حربہ تھا، اور زلخا کے ذریعہ سے بھی وہ اب کسی کامیابی کا متوقع نہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے اب مایوسی کی تاریکیاں اس پر غالب ہو گئیں، اور بے چین ہو کر وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ خاصاً نے آگ کے شعلوں سے حملہ کیا اور رات کی تاریکی میں آتشباری شروع ہو گئی۔

اس طریقہ جنگ سے رات کے تھوڑے حصہ میں ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں اور ان مقتولین آتش کی چیخوں سے ساری فضا نالہ و فغاں سے معمور ہو جاتی ہے، شہر اور آبادی کی حسین ترین عمارتیں اور انکی دلکش آرائشیں نذر آتش ہو رہی ہیں۔

ہر چند اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب دنیا میں کوئی جائے پناہ نہیں رہ گئی، لیکن اپنی مستقل بے غیرتی کے ساتھ مریدوں سے کہتا ہے:-

اب کیا غور و تامل ہے؟ اب جبکہ ہم کامیابی کے دروازہ پر کھڑے ہیں، کیا پس پیش رہی؟ ہر چند قدرت نے ہماری جماعت کو قلیل و مختصر کر دیا ہے اور ان لوگوں کو ہم سے چین لیا ہے جو اسکی روشنیوں کو چمکانے کا سبب تھے، تاہم ہمیں بادشاہوں اور سلطنتوں کو تباہ کرنا ہے، کیا تم نے قدرت پر اعتقاد رکھنا چھوڑ دیا ہے، اس قدرت پر جو تمہاری روشنی اور تمہارا ستارہ ہے؟ کیا تم یہ یقین نہیں کرتے کہ تمہارے پیغمبر کی نگاہوں میں آسمانی بجلیاں چھپی ہوئی ہیں اور وہ چشم زدن میں اس حملہ آور فوج کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے؟ یاد رکھو کہ وہ بجلیاں جو اس وقت تک مستور تھیں، اب دنیا ان کا تماشہ کرے گی۔ اور آج کی شب میرے برگزیدہ مریدو! تمہاری خستہ و در ماندہ روحوں کیلئے وہ سامان اکل و شرب مہیا کیا جائیگا، جو گروہیاں عرش کی غذا ہے، جو تمہارے اندر تمہاری روحوں کو نئی زندگی سے معمور کر دے گا۔ تمہارے واسطے بادۂ احمر فراہم کی جائے گی، جو یہ چشم حوران بہشت صرف اپنی محبوب ندیموں کو پلایا کرتی ہیں۔ اور تمہاری سرتوں کے لئے آج کی شب تمہارا پیغمبر اپنے تجلی بارچہرہ سے نقاب جدا کر دیگا۔

مفتح کا ایک ایک لفظ جماعت پر سحر کا سا کام کرتا ہے، اور یہ لوگ پھر ایک نئی طاقت عمل سے لبریز نظر آتے ہیں، لیکن انکی یہ حیاتِ تازہ ایک سراسر ابی زندگی ہے، جس طرح دم نزع کوئی

شخص سنبھالا لے اور ایک شربت کا گھونٹ لیکر ختم ہو جائے۔ وہ اپنے نیروں اور تلواروں کو جوش
 مسرت میں بلند کر کے "آج کی رات" کا نعرہ لگاتے ہیں، متفع بھی انکا ہم آہنگ ہو جاتا ہے، مگر
 اسکی آواز میں جوش و شوق معدوم ہے، اور اسکا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا ہے۔ دنیا نے ان
 صید ہائے فریب خوردہ کی مسرتوں سے زیادہ المناک شاید ہی کوئی مجلس عزاء دیکھی ہو۔
 رات نصف سے زیادہ گزر جاتی ہے، اور سرخوشانہ مگر بے نتیجہ نعروں کی ہنگامہ آرائی کے بعد
 ایک خوفناک سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ زلیخا ویرانی دہلی سو گوار زلیخا، دوسرے حصہ مکان میں متفکر و
 متامل ہے، کہ ایک غلام، متفع کی طرف سے پیغام طلب لیکر آتا ہے۔ وہ اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے
 اس پیغام کو سناتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اسکا رنگ سیاہی مائل ہو جاتا ہے، اور اس سے قبل کہ وہ
 پیغام کے الفاظ دہرا سکے، زلیخا کے قدموں پر مردہ ہو کر گر پڑتا ہے۔ زلیخا سر سے پیر تک لرز جاتی ہے کہ اب
 خود اسکا وقت بھی نزدیک ہے۔

ساری فضا خاموش ہو گئی تھی، حتیٰ کہ دشمنوں کے کیمپ سے بھی کوئی صدا نہیں آرہی تھی۔ اس سکون
 مطلق میں زلیخا مقام حشن کی سمت روانہ ہوتی ہے، لیکن دفعتاً ٹھہر جاتی ہے اور اپنے سامعہ کو ایک طرف
 متوجہ کر دیتی ہے۔ آہ، یہ متفع کے قہقہہ کی آواز تھی، مگر اس آواز خندہ کے بعد ہی ایک نہایت خوفزدہ
 آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ کیا یہ صدائیں، محفل عیش اور مقام حشن سے آسکتی ہیں؟ وہ اندر داخل ہو جاتی
 ہے اور ایک پُر آواز منظر دیکھتی ہے۔ زردی مائل نمود صبح کی روشنی، شمعوں کی سفید و نحیف روشنی سے
 ملکر، جس منظر کو زلیخا کے سامنے پیش کر رہی ہے، وہ یہ ہے کہ تختہ ہائے محفل کا نفیس فرش ابتر ہے، بخوردان
 آخری سالنیں لے رہے ہیں، پہلوؤں کے شکستہ ہار بکھرے ہوئے ہیں، صراحیاں اور پیالے جو بادہ طلا رنگ
 سے بہرے اور نہایت بے صبر و حرصانہ طریقہ پر خالی کئے گئے تھے، جا بجا اوندھے پڑے ہیں۔ یہ سوال
 فضول ہے کہ وہ کس قسم کے جرعوں سے لبریز تھے، کہ اسکے آثار سے تو اس مقام کا ہر حصہ معمور ہے۔
 جشن کے ہر نہمان کا چہرہ یا تو سیاہ ہو کر سینے کی طرف جھک گیا ہے، یا آسمان کی بلوری صباختوں کو دیکھتا
 کا دیکھتا رہ گیا۔ بعض جو درحقیقت بہادر تھے، اور میدان جنگ میں اپنے پیغمبر کے پہلو بہ پہلو نہایت کشادہ
 پیشانی کے ساتھ موت کا خیر مقدم کرنے کو طیار و آمادہ تھے، اسوقت بحس و حرکت ہو کر رہ گئے ہیں، مگر
 ان کی حالت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس عیاری و مکاری سے وہ دم واپس میں واقف ہوئے

تھے، اور یہی وجہ ہے کہ جذبہ انتقام اُن کی آنکھوں میں قائم ہو کر رہ گیا ہے۔
 مقنع کا نقاب اٹھا ہوا ہے، تاکہ رہروانِ حجیم کی آخری نگاہیں اچھی طرح سیراب ہو لیں، لیکن وہ
 اسکی شکل میں اس تجلی موعود کو نہیں پاتے، جن کی برقِ صفتی و شمنوں کی جمعیتِ عظیم کو اُن واحد میں
 خاکِ سر کر دینے والی تھی؛ بلکہ وہ ایک صورت دیکھتے ہیں، جسکے سامنے عفریتِ جنم اور غولِ بیا بانی
 ہی خوش منظر و خوبصورت کہے جاسکتے ہیں۔ مقنع بعض ہلاک شدہ اور بعض نیم جاں فدا یانِ مذہب
 کو مخاطب کر کے کہتا ہے:-

اے عاقلانِ برگزیدہ! اپنا ستارہ، اپنی روشنی دیکھ لو، تم کسی نہ کسی کا حیلہ کار اور شکار
 ہونے کیلئے مخلوق ہوئے تھے، کیا یہ کافی نہیں؟ اور کیا یہ ضروری ہے کہ میں وہ آخری
 ذرہ زندگی بھی، جو تمہارے باقی رہ گیا ہے، تم سے چھین لوں؟ تمہیں معلوم ہے کہ یہ مرگ
 ہیبت جو تمہارے اندر اسوقت شعلہ زن ہے، وہ درجہ بخود دی ہے، جہاں سے
 برکاتِ سماوی شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ مکروہ صورت جس سے زیادہ بد مہیت شکل کبھی
 بھی ظالم نسل انسانی کی تحقیر کا باعث نہیں ہوئی، خود قدرت کی وضع کردہ اور پسندیدہ ہے۔
 افسوس میری تبریک و تهنیت نصف ہی بیان نہ ہونے پائی تھی کہ یہ ناشائستہ رو جس
 پر داز کر لگیں، اچھا نیک روح، الوداع!

ابا، میری نوجوان عروس! بہتر ہوا کہ تو آگئی، معلوم ہوتا ہے تو نے اس سے قبل مردوں
 کو کبھی نہیں دیکھا۔ کیونکہ تو کانپ رہی ہے۔ نہیں، تو تو اُن کو دیکھ چکی ہے، میری پیاری
 انہوں نے تو ہمارے عقد کی رسم ادا کی تھی، آج میرے ان مہمانوں نے اپنے رخصتی جام
 خوب لہریز کئے اور لازم ہے کہ تو بھی ایک پیالہ شراب پر تجددِ عہد کرے۔ مگر یہ کیا ہے؟
 یہاں تو شراب کا ایک قطرہ ہی باقی نہیں رہا، اور تمہارا ظرف خالی پڑے ہیں۔
 میری نوجوان محبوبہ! تجھ سے قبل یہاں حریصوں کا جمع تھا، اور انہوں نے ایک قطرہ
 شراب ہی باقی نہیں چھوڑا، لیکن ذرا ٹھہرا، ایک قطرہ باقی رہ گیا ہے، وہ اسقدر کیف پرور
 ضرور ہوگا کہ ایک نازک پیغمبرہ کے خون کو حرارت میں لے آئے۔ لے، پی جا! اور اگر
 تیرے عاشق کا دست نصرت اس مقام تک دراز ہو سکے اور اسوقت تک تیرے

لوں کا نشف و انجذاب زائل نہ ہو جائے، تو اپنے ایک بوسہ کے ذریعہ سے اسکا نصف زہر اُس کو پہنچا دیجیو۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے اپنے رقیب کی یہ خوش نصیبی و عشرت پذیری کہ وہ تیرا بوسہ لے، گوارا ہو سکتی ہے اور میں اُس کی اُس جرات کو نظر انداز کر سکوں گا۔

مجھے اب خود ہی فنا ہو جانا ہے، لیکن میں ان سہت و ذلیل لوگوں کی طرح فضا کو متعفن نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس طرح نہیں مرنا چاہتا کہ میری لاش کی ذلت کی جائے اور جب میں دفن کیا جاؤں تو دنیا طعن کرے کہ ”یہ ہے وہ جو پیغمبری یا خدائی کا مدعی تھا“ میں آتش شعلہ زن میں اپنے تئیں جلا کر خاکستر کر دوں گا، کیونکہ وہ ایک ایسا غسل نور ہوگا، جو پیغمبروں کے لئے موزوں ہے۔ اس سے قبل کہ مجھے یہ شعلہ راکھ کی صورت میں بدل دیں، تیری نبضیں ہی ساقط ہو چکی ہوں گی۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ ایک متنفس بھی ایسا باقی رہے جو میرے بعد دنیا کو اطلاع دے کہ تمہیں کہاں گیا ہیں یہ چاہتا ہوں کہ میری شہرت، جو ہوت و معلوم کہاں کہاں پر شاں ہے، دنیا کے سامنے کہہ سکے کہ ”پیغمبر آسمانی تو آسمانوں سے آیا تھا اور آسمان ہی کی سمت چلا گیا، اور صرف اُسے روپوش ہوا ہے کہ ایک روشن اور بے نقاب متبسم کے ساتھ دنیا میں پہنچا یا جائے۔“ دنیا اپنی خوش اعتقادی سے میرے نام کی عبادت گاہیں قائم کرے گی، جہاں چالاک و حیلہ جو لوگ مجاور ہی کیا کریں گے۔ اور اس طرح میں مرکز ہی اس نسل انسانی سے انتقام لیتا رہوں گا۔

اب وقت باقی نہیں رہا ہے۔ دیکھ کہ مجھ جیسا بدکردار کیونکر ایک معبود بن سکتا ہے! متفنع کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے آخری جملوں کے ساتھ ہنی اپنے تئیں آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیتا ہے، اور زلیخا تہنارہ جاتی ہے۔

صبح نمودار ہوتی ہے اور محاصرین، شہر کی دیوار پر حملہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ دیوار میں ایک چوٹا سا راستہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عظیم فوج کے بڑے حصہ کو نیکر اندر داخل ہو جاتا ہے، ہر خد کہ خلیفہ ہمدی کو اس طرح داخل ہو جانے میں تامل ہوتا ہے شہر کے راستے قطعاً ویران ہیں، اور یکسر خاموشی طاری ہے، الغد ام حیات کا ثبوت ہر قدم پر نظر آرہا ہے، تمام سپاہ اسلام حیران و سرگشتہ ہے کہ سامنے سے

ایک نقاب پوش ہستی نمودار ہوتی ہے۔ اور وہی ہے، اکاشور مخ جاتا ہے، متنع اور تنہا، کا غل بپا ہو جاتا ہے۔ اسکو دیکھتے ہی عظیم، خلیفہ کی رکاب پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے خلیفۃ المسلمین، میرا حصہ ہے۔ اس شیطان مجسم کو میرے سوا کوئی قتل نہ کرنے پائے۔ حضور سے میری یہی ایک التجا ہے، خلیفہ اس درخواست کو منظور کر لیتا ہے، اور عظیم نہایت سرعت کے ساتھ، نقاب پوش کی جانب بڑھتا ہے، اور جیسے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتے ہیں، عظیم کا نیزہ اس کے جسم میں تیر جاتا ہے۔ نقاب سرکٹا اور چہرہ کھل جاتا ہے اور عظیم، متنع کے بجائے جمال زلیخا کا نظارہ کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اسکا خون حیات بہا جا رہا ہے، اور اپنے رخشہ ناک ہاتھوں سے اُسے اٹھا لیتا ہے۔ زلیخا کہتی ہے:-

”آہ عظیم! میرے پیارے! میں نے یہ خیال ہرگز نہیں کیا تھا کہ اس اداے فرض کی تکلیف تلو دوں، تمہاری موجودگی میں اس طرح کی موت آنا، ہر چند کہ بشمار لذات و برکات کا موجب ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم باوجود میری نااہلی کے مجھے ان سے محروم نہ کرنا چاہو گے۔ کاش تم جان سکتے کہ میں نے کتنی بار خدا کی درگاہ میں یہ تمنا کی ہے کہ میری موت تمہاری موجودگی میں آئے! ملعون متنع کا زہر اس قدر قلیل تھا، کہ اسکا اثر اب تک نہ ہو سکا اسی لئے میں نے چاہا کہ اس کا نقاب پہن لینے سے فوراً ہی تو صدمہ تلوار میں میرے اوپر برسے لگیں گی اور میں چشم زدن میں اس کرب سے نجات پا جاؤں گی۔ شکر ہے کہ اسوقت وہ تمام ظلمت و تاریکی، مایوسی و بیچارگی، جو میری آوارہ روح کی انیس تہی، نہایت آسانی سے رفع ہوتی جا رہی ہے۔ تمہاری نگاہ لطف کی روشنی میرے اوپر اس طرح نازل ہو رہی ہے، جس طرح رحمت خداوندی کی اولین نمود صبح۔ اور اگر تمہارے پیارے لبوں سے میں یہ سن سکوں کہ تم نے مجھے معاف کر دیا، تو میں فرشتوں کی زبان سے بھی یہ الفاظ دہراتے ہوئے سن لوں گی۔ لیکن میرے پیارے عظیم، اُف! تمہیں اپنا کہہ کر لکھا رہا ایک رویا ہے جنت ہے، تم زندہ رہنا! میرے لئے زندہ رہنا! اگر تمہیں کبھی بھی مجھ سے محبت ہوئی تھی، اگر تمہارے لئے اپنی زلیخا سے دوسرے عالم میں ملنا گوارہ

ہو سکتا ہے، تو زندہ رہنے کی کوشش کرنا! اور صبح و مساء درگاہ خداوندی میں، جسکے حضور، عظیم، تمہارے ہونٹھوں اور دل سے پاکتر ہونٹھوں نے گہری دعا مانگی ہوگی، میرے لئے دعائے مغفرت کر؛ شاید اس کی رحمت سے، اس لئے کہ تم طلب عفو کرو گے، اور اس لئے کہ میرے دل میں تمہاری محبت کا مسکن ہے، مجھ پر عنایت ایزدی ہو جائے!

ان باغوں اور مرغزاروں میں جانا جہاں اول اول، دو دل ایک دوسرے میں جذب ہو گئے تھے۔ اس فضا میں صبا کا ہر جھونکا وہاں کے ناقابل فراموش پہلوؤں پر سے گذرتا ہوا تمہاری روح کے لئے پہرہ ہی شیریں اور معصوم ساعتیں پیش کرے گا۔ اور ممکن ہے کہ تمہارے دل میں بدیہ زلیخا کے لئے پہرہ ہی جذبات پیدا ہو جائیں۔ شبنم کے ان قطراتِ عشق سرشت کی طرح، جو جلوہ خورشید کے عکس فگن ہوتے ہی، جو سما میں جذب ہو جاتے ہیں، تمہاری دعائیں ہی محبت کی تمام خوشبوؤں کے ساتھ عرش تک پہنچیں گی اور اگر ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب میرے حواس ساتھ نہیں دیتے ہیں ان ایک لمحہ ۔ ۔ ۔ اور اگر تمہاری دعائیں مقبول ہوئیں اور اگر مغفور روحیں اس دنیا میں اسلئے آسکتی ہیں کہ وہ اپنی راحتوں اور مسرتوں کا اظہار ان پر کر سکیں، جن کے ساتھ انکو محبت رہی ہے تو میں تمہارے پاس آؤنگی، ایک خواب شیریں بنکر آؤنگی اور کہوں گی ”میں وہی ہوں!“ پیارے محبوب، خدا حافظ!،

(۷)

دنیا میں کیسے ہی اہم اور سنگین حادثات اور واقعات کیوں نہ رونما ہوں، وقت کی روانی کچھ اس قدر سریع اور اس درجہ منہمک ہے کہ اسکو کوئی شے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی؛ اور وہ کسی کے روکنے سے نہیں رکتی۔ زلیخا کی ہلاکت کے بعد زمانہ گذرتا گیا حتیٰ کہ عظیم نے اپنے شباب کو شیب سے بدل لیا۔

دریاے جیحون کے مصفا کناروں پر ایک بوسیدہ قبر کے پہلو میں ایک ضعیف آدمی جھکا ہوا ہے، آفتابِ صباحی نے مدتوں اسکے غمزہ چہرہ پر آنکھ کھولی ہے، اور شام کے ستارے ایک مدت سے اُسے اسی طرح مشغول و غادیکھ رہے ہیں۔ آج اسوقت بھی وہ اس فرضِ محبت کے ادا کرنے میں مصروف و محو ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اسکا یہ فرض اب ختام کے قریب ہے، کیونکہ اسکے چہرہ پر

علاماتِ مرگ نمایاں ہیں، لیکن اسکے ساتھ موت کی حسرتوں میں ملی ہوئی ایک شعاعِ طمانیت
اسکی ضعیف مگر منور پیشانی پر موجزن نظر آرہی ہے، جس نے موت کو بھی حسین و پر رونق بنا دیا
ہے۔ جس طرح شام کی آداس تارکیوں میں شفق کا شہابی رنگ دلکش ہو جاتا ہے، اسی طرح
اس ضعیف ہستی کی چند آخری سانسیں بھی رنگینیِ مسرت سے دمک رہی ہیں۔

گذشتہ رات اس نے زلیخا کو خواب میں دیکھا ہے جو اس سے عالمِ رویا میں کر رہی ہے
رحمتِ الہی نے میری نغز شہوں کو معاف کر دیا! یہ مژدہ روحِ فزاسن لینے کے بعد عظیم شکرانہ
نعمت میں اپنی آخری سانسوں کی صرف کر دیتا ہے اور خود بھی زلیخا کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے
الفت و مسرت کی نیند میں غرق ہو جاتا ہے۔

ل۔ احمد

غزل

از حضرت سہا (علیگ)

جھگڑے ہیں ندگی کے سب، آ، اور انہیں مٹا بھی جا
جذبِ دُروںِ قلب کو، بے ادب جنوں تو کر
میری تباہیوں کا کیا، عشوہ طرازیوں تو ہیں
عیش کی راحتیں نہیں، کرب کی کروٹیں سہی
دل سے فرازِ عرش تک آہ کن راہِ راست ہے
آج تو مرگ ناگہاں، غم سے ہمیں چھڑا بھی جا
اپنے بھی دل کی کہ گزرا، اور اُسے آزما بھی جا
تجک و وفا سے کیا غرض، تو تو نظر چڑا بھی جا
عمر رواں کے ناز ہیں۔ چند گھڑی اٹھا بھی جا
درد بھی ایک راز ہے، دل ہی میں کھچپا بھی جا

خوفِ مزاج یار کا، شوق سے کیوں فزوں رہے
کیا پس و پیش ہے سہما، بڑھکے گلے لگا بھی جا

مزار

(از حضرت ناصر اٹاوی)

چراغِ کشتہٴ عمرِ میدہ کا دہواں ہوں میں
مرا ہر ذرہ لبرِ نوازے سازِ ہستی ہے
اماں ہے کشمکشِ جہاں سے میرے پہلو میں
ٹھکانا مل گیا ہے سرکشوں کو سر چپانے کا
تلی ہے گردشِ ارضِ فلک میرے مٹانے پر
کشیدہ بادِ صرصر، ابر باراں در پئے ایندا
جوانی میں مٹا ہے کوئی ناکام غمِ الفت
مری آغوش میں مدفون ہیں لاکھوں تمنائیں
دلِ وحشت نصیبِ ناصرِ خانماں ہوئیں

انور نے اپنی تمام عمر صرف ایک خیال کی پرستش میں بسر کر دی، لیکن اس کی حیات میں جو سرا
اضطراب و خلش تھی۔ اس سے زیادہ ہلک لمحہ کوئی نہ ہوتا تھا جب اس سے یہ یقین ہو جاتا
لگتا تھا کہ اس کا موضوع پرستش ایک حقیقت مری ہے

مختصر

مسئلہ نور پر اک ملکی سی روشنی

جناب محترم، ابوالحسن مولوی محمود علی صاحب، اگر ۱۲ فروری کی وہ صحبت آپ کی یاد سے
محو نہیں ہوئی جس کے آخری لمحات میں مسئلہ نور کے متعلق میرے اور آپ کے درمیان اک مختصر
سی بحث ہو کر رہ گئی تھی، تو میں آپ کی توجہ اس طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں اور آپ کے اس
دعوے پر کہ ”نور متحرک ہے اور اجسام صغارا کا مجموعہ“ میں اپنے شبہات پیش کرتا ہوں۔
مجھے امید ہے کہ آپ اپنے خیالات نگار ہی کے ذریعہ سے پیش فرمائیں گے اور نہایت آزادی سے
ان اختلافات کو بیان کریں گے جن کا تعلق میرے اعتراضات سے ہے۔

نشان

(۱) حکماء کا دعویٰ ہے کہ ”نور جسم ہے اور حرکت کرتا ہے“ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے نور کو
جسم اس لئے خیال کیا، کہ اس میں حرکت پائی جاتی ہے یا اس کی حرکت اس لئے تسلیم کی کہ وہ جسم ہے،
لیکن بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، کہ انہیں سب سے پہلے نور کی حرکت کا خیال پیدا ہوا، اور
بعد کو اس حرکت کی وجہ، جس سے نور کو جسم ماننا پڑا، اس لئے اب عام طور سے نور کی حقیقت اس طرح
بیان کی جاتی ہے کہ:-

”نور، اجسام صغارا کا مجموعہ ہے جو جسم مضی سے جدا ہو کر جسم مضی پر آکر گرتا ہے۔“
ہمیں سب سے پہلے نور کو جسم فرض کر کے، یہ دیکھنا چاہیے، کہ اس میں حرکت کس قسم کی
ہوتی ہے۔ حرکت کی تین صورتیں ہوا کرتی ہیں:- ارادی، طبعی، قسری۔ غالباً اس سے تو
آپ کو بھی انکار نہ ہو گا کہ نور کی حرکت ارادی نہیں ہے، یعنی خود وہ قصد و ارادہ کر کے حرکت
نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ آپ کہیں نور کی حرکت طبعی ہے، لیکن یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ حرکت طبعی
ہمیشہ ایک جہت میں ہوتی ہے اور نور (حرکت فرض کر لینے کی صورت میں) کی حرکت ہر جہت
میں محسوس ہوتی ہے۔ رہ گئی حرکت قسری، سو وہ بھی تسلیم نہیں کی جاسکتی، کیونکہ حرکت قسری
(یعنی حرکت مخالف طبع) بھی وہیں پائی جاسکتی ہے، جہاں حرکت طبعی کا وجود ہو۔

جب جسم کی تینوں حرکتیں، نور میں نہیں پائی جاتیں، تو ظاہر ہے کہ وہ جسم نہیں ہے۔ یہ واضح رہے کہ آپ جسم کو عرض ہی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ وہ آپ کی قول کے مطابق آفتاب سے منتقل ہو کر زمین تک پہنچتا ہے اور اعراض کا انتقال محال ہے، اسی طرح آپ اسے جو ہر بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو ہر محدود ہے، ہیولی، صورت، عقول، و نفوس میں واجب الوجود ہی آپ اسے نہیں کہہ سکتے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہ موجودات کی کسی قسم میں داخل نہیں اور اس کا وجود فی الخارج کہیں نہیں پایا جاسکتا۔

(۲) اسی سلسلہ میں اگر آپ نگاہ کو بھی نور سمجھ کر اس میں حرکت ثابت کریں گے، تو یہاں بھی حرکت کے متعلق وہی گفتگو پیش آئے گی جو ابھی عرض کی گئی۔ لیکن اگر آپ بصارت کو صرف انطباع کہیں گے (یعنی صورت مرئی آنکھ کے پردہ پر منطبع ہو جاتی ہے) تو یہی بہت سی مشکلات آپ کو رفع کرنا پڑیں گی۔ کیونکہ انطباع اور صورت مرئیہ کے درمیان جو ربط پایا جاتا ہے، وہ تین حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو صورت مرئیہ، انطباع کے وقت اپنی جگہ سے جدا ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ یا دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ اگر آپ جدا ہونا تسلیم کریں گے، تو صورت مرئیہ کا وہاں سے فنا ہونا لازم آئے گا جو بالکل خلاف واقعہ و حقیقت ہے اور اگر جدا نہیں ہوتی تو آنکھ میں کوئی نئی کیفیت پیدا نہ ہوئی جس سے حقیقت انطباع واضح ہو سکے۔ تیسری صورت کا بطلان ظاہر ہے کیونکہ ایک ہی وقت میں کوئی شے دو مختلف چیز و محل میں نہیں پائی جاسکتی۔

اگر آپ کہیں کہ شے مرئیہ کا احساس، عرض کی صورت میں ہوتا ہے، یعنی اس کے اعراض منطبع ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ انطباع، مقولہ کیفیت سے ہوگا یا کم سے، اگر مقولہ کم سے ہے، تو وہ قار الذات ہوگا اور اس کا ادراک ہاتھ سے بھی ہو سکیگا۔ اگر مقولہ کیفیت سے ہے تو اسے وجدانی ماننا پڑے گا، لیکن وہ وجدانی نہیں ہے کیونکہ کیفیت کسی محل میں اور وجدان اس کا کسی اور محل میں ممکن نہیں، آپ غیر وجدانی ہی نہیں کہہ سکتے کیونکہ پھر اسے جو اس اربعہ سے محسوس ہونا چاہیے حالانکہ یہ باطل ہے۔

(۳) نور اگر اجسام صغار کا مجموعہ ہے، تو چاہیے کہ زیادتی نور کی، اشیاء مرئیہ کو اور دھندلا کر دیا کرے، کیونکہ زیادتی نور، زیادتی اجسام ہے، اور اجسام کی زیادتی بصارت اور شے مرئی کے درمیان حائل ہو کر مانع بصارت ہو کر رہتی ہے۔

اسکا جواب آپ یہ دے سکتے ہیں کہ یہ شان صرف رنگین و کثیف اجسام کی ہے کہ وہ بصارت اور شے مرئی کے درمیان حائل ہو جائیں، اجسام شفاف پر یہ بات صادق نہیں آتی، لیکن اس صورت میں آپ کے پاس کیا جواب ہوگا اس اعتراض کا کہ ایک کوتاہ نظر شخص کیوں نہیں مجذب شیشے کی عینک سے، اسی طرح صاف دیکھتا، جس طرح ایک ضعیف البصارت آدمی۔ اور کیا وجہ ہے کہ ایک متعثر شیشے کی عینک، کمزور نگاہ کے لئے بالکل بیکار ہے۔ آپ یہاں پہر اسی مسئلہ بصارت انطباع کا حوالہ دیں گے، لیکن میں پھر وہی اعتراض کر دینگا جو اس سے قبل بیان کر چکا ہوں۔

(۴) نور اگر اجسام صغیر کا مجموعہ ہے، تو ظاہر ہے کہ ان اجسام میں بالطبع روشنی موجود ہے اور جب تک وہ فنا نہ ہو جائیں ان میں روشنی کا وجود ہونا چاہیئے جس وقت آپ کسی کوٹھری کے روشن دان کو بند کر دیتے ہیں تو کیوں دفعۃً تاریکی ہو جاتی ہے۔ اگر نور کے اجسام صغیر کوٹھری کے اندر موجود ہیں، تو تاریکی نہ ہونا چاہیئے اور اگر وہ اجسام فنا ہو گئے تو کیوں اور فنا ہو کر وہ کہاں گئے۔

(۵) اگر کسی کمرہ میں صرف ایک سوراخ روشنی کیلئے ہو، تو چاہیئے کہ اگر کوئی دبیر شیشہ اسپر لگا دیں تو روشنی نہ آئے کیونکہ نور کے اجسام صغیر اندر داخل نہ ہو سکیں گے۔ اگر آپ نے اسکا جواب یہ دیا کہ وہ ایک مادہ اثیر یہ ہے، جو شیشے کے اندر سے نفوذ کر جاتا ہے، تو اسپر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ جب شیشہ کو سیاہ رنگ دیا جاتا ہے تو پھر یہ مادہ اثیر یہ کیوں آپس میں نفوذ نہیں کرتا۔

(۶) اگر رویت کی حقیقت، سراسحاق نیوٹن کے اصول کے مطابق یہ ہے کہ ”جب اجزاء نور، کسی جسم کو روشن کر کے پلٹے ہیں تو اسی کے ذریعہ سے وہ اشیاں ہلکوا نکھ سے نظر آتی ہیں“، تو چاہیئے کہ جس وقت اجزاء نور موجود نہ ہوں، بلا استثناء کوئی چیز کسی کو نظر آئے، درانحالیکہ ”شپر چشم“ کا فلسفہ بصارت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ رات ہی کو زیادہ دیکھتا ہے اور دن کے وقت جب اجزاء نوری کثرت سے پائے جاتے ہیں تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ علاوہ اس کے امریکہ میں ایک خاتون ہے جو شب تار میں نہایت اچھی طرح کتاب پڑھ لیتی ہے۔

(۷) آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس وقت انسان دھوپ میں چلتا ہے، تو اسکے ساتھ ساتھ سایہ بھی چلتا ہے، اس صورت میں چونکہ سایہ کی حرکت بدیہی ہے اسلئے آپ کو اسے بھی جسم کہنا

چاہئے دراصل ایک کوئی شخص سایہ کو جسم نہیں کہہ سکتا۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ حرکت سایہ میں نہیں ہوتی بلکہ سایہ ایک جگہ پیدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے، اور پھر دوسری جگہ پیدا ہوتا ہے، لیکن چونکہ جسم کی حرکت کے ساتھ وہ بہت جلد جلد بگڑتا اور بنتا ہے، اس لئے ہم کو آنکھ سے ایسا ہی نظر آتا ہے۔

اگر روشنی کی حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تسلیم کی جائے، کہ جب آفتاب کے محاذ میں کوئی چیز آتی ہے تو منور ہو جاتی ہے، اور محاذ کے ساتھ ساتھ روشنی مٹتی اور پیدا ہوتی رہتی ہے، تو اس سے صرف ایک شے محسوس کا علم تو ہو جائیگا لیکن اس نور کی کیفیت پر بھی مبہم رہ جائیگی۔
(۸) اگر آنکھ کا نور بھی آفتاب کے نور کے مانند ہے اور ضیاء چشم کا نور آفتاب سے متاثر ہونا ضروری ہے، تو اس سے تداخل اجسام لازم آئیگا، جو محال ہے، اور اگر تداخل اجسام نہ مانئے گا، تو پھر نور بصارت کا کسی اور طرح متاثر ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۹) مجھے امید ہے کہ آپ اس پر کامل غور کریں گے، ممکن ہے کہ آخر میں میری طرح آپ پر بھی یہ سب کچھ صرف نفس کی ایک ”کیفیت انکشافیہ“ نظر آئے اور تمام تحقیق، محض ظن و تخمین کا کرشمہ ثابت ہو۔

یہ بحث بہت طویل ہے لیکن میں نے اس کے تمام پہلوؤں پر ابھی سے اس لئے روشنی نہیں ڈالی، کہ آپ کے لئے ان سب کا جواب دینا فرصت مدید کا طلبگار ہوتا اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس وقت کم ہے، لیکن اگر آپ نے اس بحث کے سلسلہ میں ان مسائل کا بھی ذکر کر دیا، جن کو میں نے قصداً ترک کر دیا ہے تو آئندہ اشاعتوں میں، میں اپنی رائے ظاہر کر نیکا مجاز ہوں گا۔

مہر منیر لکھنوی کی ایک غزل موصول ہوئی ہے جس کا یہ شعر نہایت خوب ہے۔

راتوں کا روئے والا زمانہ سے اٹھ گیا

تا صبح خوب چین سے سو یا کرے کوئی

محبت کی بوی

(اثر: نیاز فتحپوری)

زمین خدا جانے کتنی بار آفتاب کے گرد تصدق ہو چکی، معلوم نہیں چاند کتنی مرتبہ کرہ ارض کی اوٹ سے اپنی پیشانی کا ہلال دکھنا دکھا کر غائب ہو گیا اور زمین کے بخارات نہ معلوم کتنی دفعہ فضا کے آسمانی میں ابر بن بن کر قطرہ زن ہوئے، لیکن رادھا نے جو عزت نشینی اختیار کر لی، وہ اسی طرح قائم رہی اور دیبل کے کسی مندر میں پوجا کرتے کیلئے وہ کبھی نہیں آئی۔

صبح و شام، مندروں کے گھنٹے اب بھی ہوا میں گونجا کرتے ہیں، دیبل کی آبادی اب بھی بدستور اپنی پر خلوص پیشانیوں کو بودھ کے مقدس استھان کے سامنے گھستی ہوئی نظر آتی ہے، لیکن رادھا پھر اپنے مکان سے نہیں نکلی اور مندر میں آنے والا ہر نوجوان یہ محسوس کرتے لگا کہ آسمان کی اس الہتہ الجہال (زہرہ) کی طرح، جو چہرہ پر ایک باز نقاب ڈال لینے کے بعد، افق مغرب کو اک مانہ دراز کیلئے بے نور بنا جاتی ہے، اب شاید رادھا بھی نظر نہ آئے گی۔

نغمائے پرستش، معبد کے در و دیوار سے اب بھی صدائے بازگشت پیدا کیا کرتے ہیں، جنگ و رباب کے تار و دہاں کی فضا میں اب بھی اپنی لرزشوں کو موسیقی میں تبدیل کرتے رہتے ہیں، لیکن اک رادھا کے نہ آنے سے جو اُداسی وہاں کی فضا میں پیدا ہو گئی ہے، گو اس کا علم بودھ کے پوجاریوں کو نہ ہو، لیکن دیبل کا ایک ایک نوجوان اس کا زخم اپنے دلیں لئے ہوئے ہے۔

(۲)

آفتاب غروب ہو رہا ہے اور قریب کی پہاڑی جو بارش کے اثر سے زمردین ہو چلی ہے، اُن گلہ بانوں کی بانسریوں سے، جو اپنا دواغی راگ قدرت کے اس شاداب چراگاہ کو سنارہے ہیں، معمور ہے۔ رادھا اپنی جنوٹری کے سامنے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی اس منظر کو دیکھ رہی ہے اور اس طرح متحیر ہے، گویا وہ ایک بت ہے، جسے یونان کے عہد زریں میں یہاں نصب کیا گیا تھا اور اب اسکی پرستش کرنے والے دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ اس کی صورت سے عشق کا ایسا سوگ ٹپک رہا ہے،

محبت کا وہ سوز ظاہر ہو رہا ہے، گویا کہ وہ اندر ہی اندرستی ہوئی جا رہی ہے اور دنیا میں اس رسم کا دیکھنے والا اور اس نوجوان غمزدہ لڑکی پر آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہے۔

راؤدھ دیپل کی ان چند لڑکیوں میں سے تھی، جن کے حُسن کی داستانوں سے وہاں کی کوئی رنگین محفل خالی نظر نہ آتی تھی، لیکن راؤدھا اسلئے زیادہ تباہ کن تھی، کہ اس کے حُسن کے ساتھ کوئی آرزو وابستہ نہ ہو سکتی تھی، اور وہ اپنی سیرۃ کے لحاظ سے اس قدر بلند تھی کہ ایک انسان کا اس سے محبت کرنا، گویا ملا را علی کی کسی مخلوق سے محبت کرنا تھا، اس لئے جب تک وہ ایک مندر میں آتی رہی، ایک دیوی ہی کی طرح اس کی عزت کی گئی اور جب اس نے آنا ترک کر دیا تو کسی میں یہ سمجھ نہ ہوئی کہ اس کے مکان تک جائے، کیونکہ ایک دیوی کے خلو تھانے میں کسی انسانی ہستی کا گذر نہیں ہو سکتا۔

(۳)

”اے پر ماتما، میں کیا کروں؟ میں اس شرم کا اظہار کیوں کر کروں، جو تیرا نام لیتے ہی میرے سارے جسم کو ایسا بنا دیتی ہے، جیسے بید کی وہ نازک ڈالی جو ہوا کا ہلکا سا جھونکا گذر جانے کے بعد بھی گھنٹوں تھرتھرا یا کرتی ہے، کانپا کرتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں راؤدھا نے تیری پوجا چوڑ دی، بیشک چوڑ دی، لیکن انہیں کیسے یقین دلاؤں کہ راؤدھا اب تیرا نام لینے اور تیرے سامنے سر جھکانے کے قابل نہیں رہی۔

اپنے دل میں، اب جس آرزو کی پرورش میں کر رہی ہوں اس کا تعلق اُسی جسم سے ہے، جسے میں نے تیرے لئے تھج دیا تھا، مگر وہ آرزو تجھ سے علیحدہ ہے۔ پھر جس نے تیری پرستش اس طرح کی ہو کہ جسم کے ساتھ اس کی روح بھی تیرے ردِ بد چھٹک جائے، وہ کیونکر تیرا نام لے سکتی ہے، جبکہ دلیں تیرے سوا کسی اور کی مورت موجود ہو، اور روح، تیرے علاوہ کسی اور صورت کے لئے بیتاب۔

میں جانتی ہوں کہ تو میری پرستش کا محتاج نہیں، تجھ پر قربان ہونے کے لئے مجھ سے زیادہ اچھی روحیں موجود ہیں، لیکن میں اپنے دل کے اس درد کو کہاں لے جاؤں، جو تیری جدائی سے پیدا ہو گیا ہے۔ اے پر ماتما، یہ کس قسم کا عذاب ہے کہ میں نہ تجھ سے

جدا ہو سکتی ہوں اور نہ مل سکتی ہوں۔ یہ کس آگ میں تو نے مجھے ڈال دیا ہے جو مجھے نہ جلاتی ہے نہ آزاد کرتی ہے۔

وہ دن جب تیرے استھان پر تیرے پوجاریوں کی قربانی ہو رہی تھی، اور میں بھی اس خیال سے اس شخص کی طرح، جس نے کوئی تیز شراب پی لی ہو، ہست و فخور تھی، کہ عنقریب کسی ظالم کی تلوار میرے سینے میں ہی تیر جا بیگی اور میں اپنی حیات کا آخری قطرہ رنگین تیرے حضور میں پیش کر سکوں گی۔ آہ، وہ وقت میں کبھی نہیں ہو سکتی، جب اسی حال میں ان ظالموں کے سردار نے دفعۃً اگر اس خونریزی کو روک دیا اور اسکو دیکھتے ہی میرا وہ سجدہ جو تیرے لئے زمیں بوس تھا، چپکے ہی چپکے، اس کی حسین ظالم صورت کے لئے منتقل ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ تو نے اپنے آسمان سے اٹھا کر مجھے نیچے پھینک دیا، اپنے تخت الوہیت سے گرا کر زمین کے نہایت گہرے عمق میں گرا دیا، لیکن روح پھر بھی اسی کے لئے سرسبز و تھی اور تجھے ہو بھالنے اور تجھ سے جدا ہو جانے پر زیادہ غمگین نہ تھی۔

لیکن اب پرانا، میں تیرا احسان کیونکر بھلا سکتی ہوں کہ اس پر بھی تو نے مجھے بچا یا اور نہ میرے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ اس کے سامنے ایک بار بے حجابانہ چلی جاتی، اور محبت کی وہ تمام لذتیں حاصل کر لیتی، جن کے لئے میں اب بھی ویسی ہی بے قرار ہوں جیسی کبھی تیرے قدموں میں ہوا کرتی تھی۔ پھر جبکہ تو نے میری ناپاک ہستی پر اتنا کرم کیا، تو کیا اس کو اور زیادہ وسیع نہیں کر سکتا، کیا تیری انگلیاں میرے دل سے اس محبت کو نکال کر پھینک نہیں دے سکتیں، جس نے تیری ستش کو چین لیا ہے، میں راضی ہوں اگر اس محبت کا نکلنا، جان کا نکلنا ہو اور اس خلش کا دور ہونا، جسم سے روح کا جدا ہو جانا ہو۔

مہینوں ہو گئے کہ صبح و شام تیرے مندر کے گھنٹوں کی آواز سن سکر کانپ کانپ اٹھی ہوں، اک زمانہ ہو گیا کہ روز تیرے استھان پر جا کر جان دینے کے لئے تڑپ تڑپ گئی ہوں، لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں میرے ناپاک قدم تیرے مقدس معبد کو خراب

نہ کر دیں، کہیں تو اس گستاخی سے برہم ہو کر، میرے دل کے اندر وہ جذبہ نہ پیدا کر دے،
جو ایک عورت کے دل سے پاکدامنی کی عزت کو محو کر دیتا ہے۔ اسے پریشور، رحم کر اور
محبت کے اس طوفان کو، جس کی لہروں پر میں نے اپنی نازک اور ٹوٹی ہوئی کشتی
اس قدر پیر جمی سے ڈال دی ہے، دور کر دے۔ تیرے غصے کی آگ میں جل جانا
مجھے منظور ہے، لیکن اس طوفان کی موجوں میں اپنی لاش دفن کرنا مجھے گوارا نہیں۔
کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب میں اس کافر کی صورت و سیرۃ میں ہزاروں عیب نہ
نکالتی ہوں، میں دل کو ہر طرح سے یقین دلاتی ہوں کہ اس کی آنکھیں خونخوار ہیں،
اس کی فطرت جفا کار ہے، اس کی چٹون غضب آلود ہے اور اس کی ساری ہستی
ناپاک و مردود، لیکن عین اسی وقت جبکہ میں یہ سب کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، دل تڑپ کر
خون کی ایک گرم موج میرے تمام شرانیں میں دوڑا دیتا ہے اور میں اس شراب کے
نشے سے مغلوب ہو کر پھر اسی کو پوجنے لگتی ہوں جس کو ذلیل سمجھنا چاہتے ہیں لیکن میں
سمجھ نہیں سکتی۔

پھر تو ہی بتا کہ اس جنگ میں کب تک مصروف رہوں اور کیونکر اپنی شکست کی
لذت کو محو کر دوں۔“

(۴)

راوہا پر اس حال میں چند مہینے اور گذر جاتے ہیں اور اس کی محبت حرارت کی اس منزل تک
پہنچ جاتی ہے جسے مصطلحات علم الکیمیا میں درجہ بیاض سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کے بعد کائنات
کی ہر چیز، صرف دُخاں ہو کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ حقیقت ہے کہ محبت، جو چنگاری کی صورت
میں اس کے دل کے اندر متمکن ہوئی تھی، اس کے لئے راوہا کا ہر نفس ہوا کا جھونکا ثابت ہوا،
یہاں تک کہ چند ماہ کے اندر وہ چنگاری اشتعال و التهاب کے تمام مدارج طے کر گئی، اور اب اس
کیلے صرف یہی باقی رہ گیا تھا کہ وہ کسی دن اپنے جھونپڑے کے گوشہ میں خاکستر کا ڈھیر نظر آئے یا اک آہ
ہو کر ہوا میں بلجائے۔

اس کی غریب بیوہ ماں نے، علاج و چارہ سازی میں پوری کوشش صرف کر دی، جس حد

تک اسکا افلاس اجازت دے سکتا تھا، اسنے کوئی دقیقہ اس کوشش میں نہ اٹھا رکھا کہ دیبل کا یہ چاند گہن سے نکل جائے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی اور رادھا روز بروز نہ ہال ہی ہوئی گئی، گویا وہ اک شمع صبا جی تھی جس کے مضمحل شعلے، صرف حلقہ شمع دان ہی کے اندر سے کچھ کچھ نظر آتے ہیں۔

اسکا جسم جو پہلے ہی بہت نازنین تھا، اب خطرناک حد تک نازک ہو گیا تھا اور اس آگینے نے اب حجاب، ایک نہایت ہی نازک حجاب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسکا وہ رنگ جو کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ جلد کے نیچے پگھلا ہوا سونا ڈوڑھ رہتا ہے، رفتہ رفتہ زعفرانی، زرد، اور سفید ہو کر اب ایسا نظر آتا تھا گویا رادھا کوئی چاندنی کی مورت ہے، جس پر بارہ کی صفیل کردی گئی ہے۔ اس کی لابی لابی گھنی پلکیں جو حسین آنکھوں پر چارشف کے سیاہ ریشمی نقاب کی طرح پڑی رہتی تھیں۔ اس کی خوبصورت لابی گردن، جس کی صباحت میں کوثر و تسنیم کا رنگ چمکا کرتا تھا۔ اس کا وہ جسم جو سینہ و کمر کے متناسب نشیب و فراز کو پیش کر کے دنیائے جذبات میں خدا جانے کس قسم کا تلاطم برپا کر دیا کرتا تھا۔ اس کی وہ پیاری پیاری پیشانی، جس کا صندل و عبیر ملا کر ایک ملکوتی منظر پیش کیا کرتا تھا۔ اس کے وہ لائے لائے بال، جو ہزاروں حلقے بناتے ہوئے ابھی ہوئی حالت میں ہی کمر کو عبور کر جاتے تھے۔ اس کے وہ رخسار جن کو دنیا نے ہمیشہ شعلہ بلورین سمجھا۔ اس کا وہ شباب جس کے اندر کائنات کے تمام سمندروں کا شدید ترین طوفان اندر ہی اندر جوش کھاتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ الغرض رادھا اپنی ان تمام خصوصیات جمال کے ساتھ جنہیں فطرت مشکل ہی سے کبھی کسی ایک ہستی میں جمع کر دیتی ہے، اسوقت غایت درجہ مضمحل اور سوگوار تھی۔ لیکن باوجود اس کے اس کی آنکھوں کا، ان آنکھوں کا جن کی کیفیات کو دنیا کا کوئی لٹریچر قلمبند نہیں کر سکتا، یہ عالم تھا کہ بجائے نگاہوں کے ان سے کہر بانی خطوط نکلنے ہوئے نظر آتے تھے اور ان کی لمعانیت "تماشا سوز" حد تک بڑھ گئی تھی۔

(۵)

دیبل میں آج ماتم بپا ہے، ہر طرف خزن و ملال کے آثار نمودار ہیں اور ہر شخص متیاب و مضطرب ہے۔ دوکانیں بند ہیں، بازار کی چہل پہل موقوف ہے اور لوگ پریشان ہیں کہ انہیں اب ایسا حکمراں

کیونکر نصیب ہو گا۔ دنیا میں کون ایسا ہے، جو اُن کے ساتھ اس رواداری کو جائز رکھے گا۔
ایسا فرما زواج جس نے باوجود اجنبی ہونے کے کبھی ہماری پرستشوں سے تعرض نہیں کیا، جو ہماری
ناقوس کی آوازوں سے کبھی چپیں بچیں نہ ہوا، جس نے ہمارے حقوق کبھی پامال نہیں کئے،
جس نے ایک معمولی جزیہ کے عوض میں ہمارے جان و مال کی پوری حفاظت کی اور جو ہمیشہ
ہمارے نزاعات کو ہمارے ہی مذہب کے مطابق فیصلہ کرتا رہا، اسے دوبارہ نہیں آسکتا،
فطرت اس راحت رسانی کی تکرار مشکل سے کرتی ہے۔

بندھ کے عامل کو گئے ہوئے مہینوں ہو گئے، اور اس کی عزت و عظمت کی یاد آخر کار
اس صورت سے پرستارانہ غدبات میں منتقل ہو گئی، کہ برہمنوں نے اسکا بت تیار کیا، تاکہ روز
صبح کو اس کے سامنے میرا عترت جھکا کر اسکی روحانی برکات حاصل کر لیا کریں۔
رات کا سکون عالم کو محیط ہے، چاند ویل کی خواب آلود آبادی پر اپنی تسکینیں ڈالتا ہوا
گذر رہا ہے اور رادھا بھی آہستہ آہستہ سپید چادر اوڑھے ہوئے اک نورانی سایہ کی طرح اپنے
جونپڑے سے نکلتی ہے اور معبدِ عظیم میں داخل ہو جاتی ہے۔

(۶۷)

”اے میری روح پر ظلم کر نہ والے کافرانسان، اے میرے بدن میں محبت کی آگ بھونک دینے والے
ظالم دیوتا، کیا خدا کی اس وسیع آبادی میں تیرے سوا اور کوئی نہ تھا، جس کی آرزو سے میں اپنے دل
کو آباد کر سکتی۔ جس کی صورت میرے دماغ میں منقوش ہو جاتی۔

میں، کہ جس کے سامنے اگر صبح کا دیوتا بھی اپنی تمام نرم و خنک روشنیوں کے ساتھ آکر صرف ایک
نگاہِ لطف کا امیدوار ہوتا، تو کبھی کامیاب نہ ہو سکتا، میں، کہ جو شام کے دیوتا کو بھی صرف اس کی
رنگین ملاحقوں کی وجہ سے قابلِ توجہ نہ سمجھتی، میں، کہ جس کے روبرو قوس قزح کی رنگینیاں، چاند
کی سیم انشائیاں، پہلوؤں کی نگہت، بہار کی طلعت اور تمام وہ چیزیں جنہیں زمین و آسمان میں
حسین کہا جاسکتا ہے، کوئی کشش و جاذبیت نہ رکھتی تھیں، تیری صرف ایک نگاہِ حریف نہ بن
سکی، اور اپنے سارے وقار کو اس طرح تیرے اوپر قربان کر دیا، جس طرح وہ کوئی سب سے بُری
چیز ہو۔

دُنیا میں کیسے کیسے جوان، کیسے کیسے حسین موجود ہیں اور اس مندر کے اندر مجھے معلوم ہے کہ جب میں بھول چڑھانے آیا کرتی تھی، تو سرزمینِ دیمل کے کیسے کیسے نوجوان سورا، صرف اس انتظار میں گھنٹوں کھڑے رہا کرتے تھے، کہ شاید میں بھول کر ہی ان میں سے کسی کی طرف دیکھ لوں، لیکن اس مقدس جگہ کا ایک ایک ذرہ گواہ ہے، کہ میری نگاہ کبھی گھونگھٹ کے اندر بھی ہلکوں سے باہر نہیں نکلی، کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ ان کو دیکھ لینا ان میں کسی آرزو کا پیدا کر دینا ہے، جس کا پورا کرنا میرے اختیار میں نہ تھا۔

لیکن تو دفعۃً نمودار ہوا اور تو نے مجھے صرف ایک نظر سے اس طرح بے دست و پا کر دیا، جیسے کند سے ہرن۔ میں نے اسی وقت چاہا کہ تو کوئی گستاخی کرے، میری جانب دستِ حرص دراز کرے اور میں تیرے اخلاق کی طرف سے متنفذ ہو کر تجھ سے بنجار ہو جاؤں اور اس طرح تیرے خیال کو دل سے نکال سکوں، لیکن مجھ پر کیسا شدید ظلم کیا، تیرے شریفانہ اخلاق نے کہ مندر میں مجھے لرزہ بر اندام دیکھتے ہی، تو نے اک نگاہ "محبت فروز" تو ضرور ڈالی، لیکن اسکے بعد اگر تو نے مجھ سے بات بھی کی تو اس طرح، گویا تو مجھے شرافت و عزت کی دیوی سمجھتا ہے اور تجھ میں نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی بھی جرأت نہیں ہے۔ تو فاتح تھا تو اس وقت مالک تھا

اور اگر تو چاہتا تو دیمل کی چرسین لڑکی تیری خدمت کے لئے حاضر ہو سکتی تھی، چہ جائیکہ مجھ ایسی غریب و بے کس لڑکی، کہ اگر تو اس وقت مجھے ذبح بھی کر دیتا تو کوئی تجھ سے میرے قصور کا پوچھنے والا نہ تھا، لیکن تو نے باوجود اسکے، کہ عنفوانِ شباب کے تمام جذبات تکمیل کے ساتھ تیرے ہر عضو سے ٹپک رہے تھے، مجھ سے جو شاید بجا طور سے اپنے حسن و شباب پر ناز کر سکتی تھی، کوئی حیا سوز التفات نہیں کیا۔ پہرا سو وقت سے کہ تو نے مجھے حفاظت کے ساتھ میرے گہر تک پہنچا دیا، اس وقت تک کہ میں تیری حسین تصویر، تیری مقدس مورت کے سامنے سرسجود ہوں، تو نے میری تلاش نہیں کی، حالانکہ مجھے تیری ہی بقیراری کا حال معلوم تھا، تو نے مجھے کبھی بنے حجاب دیکھنا ہی گوارا نہیں کیا، حالانکہ میں جانتی ہوں تو اس کے لئے کیا کیا ٹرپا کیا۔ صرف اس لئے کہ تو نے میری عزت کے مقابلہ میں اپنی تمناؤں کا خون کر دینا آسان سمجھا اور تو نے یہ کبھی گوارا نہیں کیا کہ لوگ را دھا کو بری طرح یاد کریں۔

میں ایک عمر تک پتھر کی ان مورتوں کے سامنے پیشانی گہستی رہی، لیکن حدود انسانیت سے ایک قدم ہی آگے نہیں رکھ سکی۔ تو نے صرف ایک بار اپنا چہرہ دکھایا اور میں اس مقام تک پہنچ گئی، جہاں کسی دیوی کی ہی رسائی نہیں۔

پہراب، جب کہ تو یہاں نہیں ہے اور شاید کہی نہ آئیگا، میں سوائے اسکے اور کیا کر سکتی ہوں کہ جب تک زندہ رہوں صرف تیری ہی پرستش کروں اور اک نئے مذہب کی بنیاد ڈال دوں جو دنیا والوں کو صرف پرستش اخلاق و شرافت کی تعلیم دے۔ تیرے لئے میری زندگی کے تمام آنسو صرف ہو چکے، میرے بدن کا ایک ایک بال تیرے لئے روچکا، یعنی پرستش کی اس معمولی منزل سے، جس سے ہر شخص واقف ہے، میں گذر چکی۔ پہراب میں تجھے صرف روح ہو کر بوجھا چاہتی ہوں کیونکہ تیرے احسان سے عہدہ برآ ہوئے اور تجھ سے مل رہنے کی تمنا اب شاید اسی طرح پوری ہو سکتی ہے۔“

(۷)

• • • • • سچ ہوتے ہی سارے دیل کو معلوم ہو جاتا ہے کہ رادھا، جس نے مہینوں سے مندر کا آنا جانا ترک کر دیا تھا، رات پو جانے کے لئے آئی اور مگر گئی۔ لوگ متحیر تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیونکر ہوا، مگر روشنی کے سامنے محمد قاسم کی وہ تصویر، جو اس سے قبل مضحک نظر آ یا کرتی تھی، مسرت رہی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے اندر کوئی روح دوڑ گئی ہے۔

نیاز

فطرت کے مشرف ہونیکا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے ہر عورت کو علیحدہ علیحدہ زبان دی ہے۔

ل۔ احمد

(ماخوذ)

دو صنّاع

ندی کے کنارے، جہاں وہ لڑکی رہتی تھی، جمالی بساطِ نقاشی بیکر اس منظر کی تصویر بنانے روز آ کر آیا، اسکا موقلم سبز، سنہری اور لاجوردی فطرتِ خواب کو بیدار کر نیکے لئے بیتاب تھا۔ لیکن روز وہ حسرت آمیز سانسیں لیتا ہوا گھر لوٹ جاتا جس حسن کو اسکا قلم نقش نہیں کر سکتا تھا وہ اس کی آنکھوں میں کھنچ کر آ جاتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اسکی طبیعت کام کرنے پر آمادہ کیوں نہیں ہوتی؟ منظر کو نقش کرنے کیلئے جو خیال اسے قائم کیا ہے اسے اپنے ذہن سے کاغذ پر منتقل کرنے سے وہ کیوں مجبور ہے؟ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جو غنائی مضحکہ کی تصویر بنی ہوئی، درختوں کی آڑ میں چھپ کر اسے دیکھتی رہتی ہے۔ اپنے گریٹ کی عدم تکمیل پر جسے وہ اسی کو سنانے کیلئے مرتب کرنا چاہتی ہے اس سے زیادہ حیران و متفکر ہے!

ل۔ احمد

غزل

نخن ناحق کا گلہ تھا کچھ ادب کا جوش تھا
نور برق معرفت بختا دل آگاہ نے
ہائے کیا دن ہیں کہ نقشِ سجدہ ہے اور نہیں
دلگی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی
سرگزشت عمر کہئے اس کو یار و داد عشق
عشق کی دنیا زمین سے آسمان تک شوق تھی
کسیا یہ فانی کر رہا تھا عالم ہستی کی سیر
آگے آگے بخودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا

فانی (بی۔ اے)

حکومت اسلام اور سنسکرت

(از نیاز فتحپوری)

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں پہلا وہ شخص جس نے سنسکرت حاصل کی، فیضی تھا، لیکن یہ درست نہیں۔ اکبر نے جس فیاضی اور دیادلی کے ساتھ، علوم و فنون کی قدر کی اور جس بے تعصبی کے ساتھ، اپنے اپنی ہندو رعایا کے جذبات کی رعایت ملحوظ رکھی، اسکا اقتضاء یہ نہیں تھا کہ صرف فیضی ہی سنسکرت کی طرف توجہ کرتا۔

یہ واقعہ ہے کہ دربار اکبری میں متعدد نفوس ایسے تھے، جو سنسکرت کے عالم خیال کئے جاتے تھے، اس لئے اولیت کا فخر فیضی کیلئے مخصوص کر دینا حسن ظن سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کی فہرست میں، جنہوں نے عہد اکبری میں، سنسکرت کی کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، علاوہ فیضی کے، عبدالقادر، نقیب خاں، ملا شاہ محمد، سلطان حاجی، حاجی ابراہیم بی نام نظر آتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جہاں کہیں اس نوع کے ترجمہ کا ذکر آیا ہے، وہاں مورخین نے ہی لکھا ہے کہ ”ہندی سے ترجمہ کیا گیا“ لیکن ادنیٰ غور سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندی سے مراد، انکی سنسکرت تھی۔

ملا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ عبدالقادر نے متعدد کتابوں کا ترجمہ، ہندی سے فارسی میں کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی محقق ہے کہ انہوں نے رامائن اور سنگھاسن بتسی کا ترجمہ کیا تھا اور اسلئے اغلب گمان ہی ہو سکتا ہے کہ وہ اصل سنسکرت زبان میں ہی ہونگی۔ عبدالقادر اور فرشتہ نے لکھا ہے کہ مہا بھارت کا ترجمہ بھی ہندی سے فارسی میں کیا گیا تھا۔ بدایونی کا بیان ہے کہ کچھ ترجمہ انہوں نے کیا اور کچھ نقیب خاں نے۔ فرشتہ، فیضی کی طرف منسوب کرتا ہے (سیر المتاخرین میں مہا بھارت کے ترجمہ کو بدایونی سے منسوب کیا ہے) یہاں ہی قیاس ہی چاہتا ہے کہ اصل سنسکرت زبان سے ترجمہ ہوا ہوگا۔

دوسری جگہ بدایونی نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے اسے طلب کر کے اتھروید کے ترجمہ کرنیکا حکم دیا۔ لیکن چونکہ یہ کام بہت مشکل تھا اس لئے ملا عبد القادر نے عذر پیش کیا۔ اور ابراہیم سرہندی اس خدمت کے لئے منتخب ہوئے۔

اس بیان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمہ اصل سنسکرت زبان سے کیا جاتا تھا ورنہ اسقدر اشکال پیش آنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ علاوہ اس کے حضرت امیر خسرو نے عشیقہ اور مثنوی نہ سپہر میں صاف طور سے ظاہر کر دیا ہے کہ ہندی سے مراد سنسکرت زبان تھی جس میں خود انہیں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی۔

یہ ذکر تو عہد اکبری کا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اس سے بہت قبل سنسکرت سے آشنا ہو چکا تھا اور اس زبان کی طرف انہیں بہت پہلے سے توجہ تھی۔

عہد ماموں الرشید میں، جو علمی نقطہ نظر سے مسلمانوں کے انتہائے عروج کا زمانہ خیال کر اجاتا ہے، جبر و مقابلہ میں محمد بن موسیٰ کا رسالہ اور فن طب پر متعدد رسائل سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کئے گئے تھے۔ اگر زیادہ غور و تامل سے کام لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس سے بھی قبل حرکت اور کام کا ترجمہ عربی میں ہو چکا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں میں ہندوستانی طب کی طرف بہت پہلے سے خیال تھا۔

علاوہ اسکے ابتدائے عہد خلافت میں نجوم، موسیقی، ہندیت، علم التعمیر، علم الاصلنام، مذہب، زراعت، سمیات، قیافہ، فراست الید وغیرہ کے بہت سے رسائل سنسکرت زبان سے عربی میں منتقل ہو چکے تھے۔

اگر مخصوص طور سے ہندوستان ہی کی تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ ابھی مسلمانوں کے قدم اچھی طرح جمے ہی نہ تھے، کہ انہیں یہاں کے علوم و فنون حاصل کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ چنانچہ ابوریحان بیرونی کے حانات سے دنیا واقف ہے کہ اس نے ہندوستان کی زبان اور یہاں کے علوم کو اس قدر محنت کے ساتھ حاصل کیا تھا کہ وہ نہایت قلیل زمانہ میں سنسکرت کی نہایت دقیق کتابوں کا ترجمہ عربی، فارسی، میں، اور عربی، فارسی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت میں نہایت آسانی سے کرنے لگا۔ محمد بن اسراریل التنوخی نے ہندوستان کا سفر ہی

صرف اسلئے کیا تھا کہ وہ یہاں کے علم نجوم کو حاصل کرے۔

جب فیروز شاہ تعلق کو تسخیر کر کوٹ کے سلسلہ میں سنسکرت کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تو اس نے حکم دیا کہ فلسفہ پیشین گوئی اور شگون کی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے۔ چنانچہ غزالہ بن خالد خانی نے اس کی تعمیل کی اور اس مجموعہ کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔ اسی کے بعد اس نے ہندو کی ایک کتاب سنسکرت سے فارسی زبان میں منتقل کی۔ ایک کتاب اس سے فارسی میں منتقل کی گئی جس کے دیباچہ میں مترجم نے لکھا ہے کہ یہ کتاب حکم سے سنسکرت میں ترجمہ کی گئی۔ بغداد میں اس سے قبل ایک کتاب ترجمہ ہو چکی تھی، جس کا نام کتاب البیطرہ تھا۔

جگہ لکھا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے قدیم فلسفہ کی کتاب کا ترجمہ فارسی میں دہلی سردار کے حکم سے ابوالحسن علی بن محمد بجلی نے کیا تھا۔ حقیقت واضح ہے کہ اس باب میں مسلمانوں کے اندر اولیت کا اس سے بہت قبل قرونِ اولیٰ میں عربوں کو اس طرف آ

نیاز

غزل

ایسے کہاں نصیب کہ ہوں بہکنار دوست
کچھ کچھ ہمارے دل کو سکون ہو چلا تھا پھر
سب شکوے دے لگے ٹھکے، بس اک جواب میں
غربت کے دن ہی کٹ ہی گئی خیر فکر ہے
یاں ہر خلش، جنوں کدہ اضطراب دل
اے واے صد ہزار تمنائے مضطرب غم
قائم ہے کہیں، خلش انتظارِ دوست
یہ تو نے کیا کیا نگرِ بقیارِ دوست
اے فربہ فریب وعدہ ناستوارِ دوست
اچھا مرا سلام لے، یادِ دیارِ دوست
واں، ہر نگہ کرشمہ بے اختیارِ دوست
خلوت میں بھی وہی ہے فریبِ قارِ دوست
گو تم نے لاکھ کام لیا غبطے نیاز
پہچان ہی گئی نگہ ہوشیارِ دوست

نیاز

معلومات

عہد حاضر کے آلاتِ ہلاکت، لہذا وہ اس کے حضور
 اس سے قبل جب امریکہ اور سپانیہ کے درمیان جنگ و قتل سے مراد سنسکرت زبانت عہد حاضر
 کی علمی ترقی نے آلاتِ حرب کی طرف جس توجہ سے کام لیا تھا کہ
 انسانیت و تمدن کو صدمہ پہنچانے کیلئے یہی مہذب انسان سے بہت قبل سنسکرت سے ٹھہرا
 نہ رکھے گا، لیکن اسکے بعد برطانیہ نے یوروپ کے ساتھ جنگ کر
 کر دی اور اس محاربہ عظیم نے اس حقیقت کو عین یقین کے دائرے عروج کا زمانہ خیال کر اجاتا ہے
 جبر و اس ایک صدی کے اندر جنگی جہازوں، توپوں، دربار و سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کر کے
 تھے۔ اگلی ترقی کیلئے وہ دنیا کا نہایت حیرت انگیز واقعہ ہے۔ اسے ہر قدر حرکت اور ترقی کے
 ترجمہ و بازی، نہ اب کہیں دست بدست لڑائی ہوتی ہے اور نہ شیر بازی تھی۔ بلکہ ہر دور میں
 رستم و اسفندیار کی داستانیں، خوابِ خیال نظر آتی ہیں اور دارا و سکندر کے افسانے صرف و اہم کی
 کرشمہ زائیاں۔

اب سے قبل ہی جنگ کے مناظر تو یہی خاک و آب تھے، لیکن پہلے اگر زمین پر و در و قوت
 جسمانی و شجاعت کا مقابلہ ہوا کرتا تھا تو اب میلوں فاصلہ سے اس حال میں کہ ایک دشمن
 دوسرے کو دیکھ ہی نہیں سکتا، ہلاکت شروع ہو جاتی ہے اور اگر پہلے سطح بحر پر معمولی کشتیوں میں
 بیٹھ کر ایک دوسرے کو پتروں کی مدد سے غرق کر دینے کی کوشش کی جاتی تھی، تو اب اسکے لئے
 وہ وہ آلات استعمال کئے جاتے ہیں کہ انکا سمجھنا بھی ہمارے لئے ہفتیوں ان طے کرنے سے کسی طرح کم
 نہیں ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ پہلے انسان، انسان سے جنگ کرتا تھا، انسانی قوت، انسانی
 سے برسرِ پیکار ہوتی تھی، اور اب بجلی، بجلی سے لڑتی ہے، علم، علم سے جنگ کرتا ہے اور نہیں کہا
 جاسکتا کہ اس محاربہ کی انتہا کیا ہوگی، جس کی ابتداء اسقدر مولناک ہے۔